شمارہ نمبر ۱۶ صفر ۱۴۳۱ھ، فروری ۲۰۱۰ء

ائمہ اہل سنت محدثین مؤمنین کا یہ اجماعی اور اتفاقی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر بلند ہے اور مخلوق سے جدا ہے۔

① جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ (م ۷۴۸) لکھتے ہیں:

وهو قول أهل السّنّة قاطبة أنّ كيفيّة الاستواء لا نعقلها ، بل نجهلها ، وأنّ الاستواء معلوم ، كما أخبر فى كتابه ، وأنّه كما يليق به ، لا نتعمّق ، ولا نتحذلق ، ولا نخوض فى لوازم ذلک نفيا ولا اثباتا ، بل نسکت ونقف كما وقف السّلف ، ونعلم أنّه لو كان له تأويل لبادر الى بيانه الصّحابة والتّابعون ، ولما وسعهم اقراره وامراره والسّكوت عنه ، ونعلم يقينا مع ذلک أنّ اللّٰه جلّ جلاله لا مثل له فى صفاته ولا فى استوائه ولا فى نزوله ، سبحانه وتعالىٰ عمّا يقول الظّالمون علوّا كبيرا

''تمام اہل سنت کا یہی مذہب ہے کہ صفتِ استواء (اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے) کی کیفیت کو ہم سمجھ نہیں سکتے، بلکہ ہم اس سے لاعلم ہیں، صفتِ استواء تو معلوم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں خبر دے دی ہے، وہ اس کے شایانِ شان ہے، ہم اس بارے میں گہرائی میں نہیں جاتے، نہ اپنی طرف سے باتیں بناتے ہیں اور نہ ہی اس کے لوازم میں نفی یا اثبات کے اعتبار سے غوطہ زن ہوتے ہیں، بلکہ ہم خاموش ہو جاتے ہیں اور اسی طرح رُک جاتے ہیں، جس طرح سلف صالحین رُک گئے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر اس صفت کی کوئی تاویل (صحیح) ہوتی تو صحابہ و تابعین اس کو بیان کرنے میں سبقت لے جاتے، نیز ان کو اس صفت کے اقرار، اس کو حقیقت پر جاری رکھنے اور اس پر خاموشی اختیار کرنے کی گنجائش نہ ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یقینی طور پر یہ بھی جانتے ہیں کہ صفاتِ استواء، نزول وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مثل نہیں، ظالم لوگ جو کچھ کہتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے بہت بلند ہے۔'' (العلو للذهبي : ص ١٠٤)

نیز لکھتے ہیں: **وقول عموم أمّة محمّد صلّى اللّٰه عليه وسلّم : انّ اللّٰه فى السّماء ، يطلقون ذلک وفق ما جاء ت النّصوص باطلاقه ، ولا يخوضون فى تأويلات المتكلّمين مع جزم الكلّ بأنّه تعالىٰ ليس كمثله شىء ...**

''تمام امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر ہے، وہ اس بات کو مطلق ہی رکھتے ہیں، جیسا کہ (قرآن وسنت کی) نصوص اس بارے میں مطلق ہی آئی ہیں۔ وہ متکلمین کی تاویلات میں نہیں پڑتے۔ اس کے ساتھ ساتھ سب اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں۔''(سیر اعلام النبلاء للذھبی : ۷۰/۱۱۔۷۱)

② شیخ الاسلام، المجاہد، القدوہ، الامام، عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ (م ۱۸۱ھ) کے بارے میں امام، حافظ، ثقہ، علی بن الحسن بن شقیق رحمہ اللہ (م ۲۱۵ھ) بیان کرتے ہیں:

سألت عبد اللّٰه بن المبارک : كيف ينبغى لنا أن نعرف ربّنا عزّوجلّ ؟ قال : على السّماء السّابعة على عرشه ، بائن من خلقه ، ولا نقول كما تقول الجهميّة : انّه هاهنا فى الأرض . ''میں نے امام عبداللہ بن المبارک سے سوال کیا، ہمیں اپنے ربّ عزوجل کو کس طرح پہچاننا چاہیے؟ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا، (اللہ تعالیٰ) ساتویں آسمان کے اوپر اپنے عرش پر ہے، اپنی مخلوق سے جدا ہے، ہم جہمیوں کے طرح یہ نہیں کہتے کہ وہ یہاں زمین میں ہے۔''(السنة لعبد الله بن احمد : ۱۱۱/۱، ح : ۲۲، ۱۷۴/۱۔۱۷۵، ح : ۲۱٦، الرد على المريسى للدارمى : ص ۱۰۳، الرد على الجهمية للدارمى : ص ۵۰ ، الاسماء والصفات للبيهقى : ۹۰۳، وسندهٗ صحيحٌ)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں: **هذا صحيح ثابت .**

''یہ قول صحیح اور ثابت ہے۔''(العرش للذهبى : ۲٤٠/۲)

حافظ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وروى عبد اللّٰه بن الامام أحمد وغيره بأسانيد صحيحة عن ابن المبارک .** ''(اس قول کو) امام احمد کے بیٹے عبداللہ وغیرہ نے صحیح سند کے ساتھ امام عبداللہ بن المبارک سے نقل کیا ہے۔''(الفتوى الحموية لابن تيمية : ص ۹۱)

حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وقد صحّ عنه صحّة قريبة من التواتر .**

''یہ قول آپ (امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ) سے اس قدر صحیح ثابت ہے کہ متواتر کے قریب پہنچ گیا ہے۔'' (اجتماع الجیوش الاسلامیۃ لابن القیم : ۲۱۳-۲۱٤)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ یہ قول ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: **قلت : الجهميّة يقولون : انّ الباری تعالیٰ فی کلّ مکان ، والسّلف يقولون : انّ علم الباری فی کلّ مکان ، ويحتجّون بقوله تعالیٰ : ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ ﴾ (الحديد : ٤/٥٧)، يعنی بالعلم ، ويقولون : انّه علی عرشه استوی ، کما نطق به القرآن والسّنّة .**

ومعلوم عند أهل العلم من الطّوائف أنّ مذهب السّلف امرار آيات الصّفات وأحاديثها کما جاء ت من غير تأويل ولا تحريف ولا تشبيه ولا تکييف ، فانّ الکلام فی الصّفات فرع علی الکلام فی الذّات المقدّسة ، وقد علم المسلمون أنّ ذات الباری موجودة حقيقة ، لا مثل لها ، وکذلک صفاته تعالیٰ موجودة ، لا مثل لها .

''جہمی لوگ یہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ ہر جگہ میں ہے، جبکہ سلف صالحین کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ کا علم ہر جگہ میں ہے، وہ اس فرمانِ باری تعالیٰ سے دلیل لیتے ہیں: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ ﴾ (الحديد : ٤/٥٧) (وہ اللہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو) کہ یہاں علم مراد ہے، اللہ تعالیٰ تو اپنے عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ قرآن وسنت نے بتا دیا ہے۔

اہل علم کو یہ معلوم ہے کہ سلف صالحین کا مذہب یہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ پر مشتمل آیات واحادیث کو اسی طرح حقیقت پر رکھا جائے گا، جس طرح کہ وہ آئی ہیں، کوئی تاویل، تحریف، تشبیہ اور تکییف نہیں کی جائے گی، کیونکہ صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں کلام ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں کلام کی فرع ہے۔ مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی ذات حقیقتاً موجود ہے، اس کی کوئی مثل نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات بھی موجود ہیں اور ان کی بھی کوئی مثل نہیں۔''

(سیر اعلام النبلاء للذہبی : ۸/٤٠٢)

③ امام ابو زرعہ الرازی رحمہ اللہ (م ۲٦٤ھ) اور امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ (م

۲۷۷ھ) سے اہل سنت کے مذہب کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

أدركنا العلماء في جميع الأمصار ، حجازا، وعراقا ، ومصرا ، وشاما ، ويمنا ، وكان من مذهبهم أنّ اللّٰه على عرشه بائن من خلقه ، كما وصف نفسه بلا كيف ، أحاط بكلّ شيء علما ... ''ہم نے حجاز وعراق، مصروشام اور یمن تمام علاقوں کے علمائے کرام کو دیکھا ہے، (عقیدے میں) ان سب کا مذہب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر (بلند) اور اپنی مخلوق سے جدا ہے، جس طرح کہ اس نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی زبان کے ذریعے بغیر کیفیت بیان کیے بتایا ہے، اس نے ہر چیز کا علم کے ذریعے احاطہ کر رکھا ہے۔'' (کتاب اصل السنة واعتقاد الدين لابن ابی حاتم)

④ امام عثمان بن سعید الدارمی رحمہ اللہ (م ۲۸۰ھ) لکھتے ہیں: وقد اتّفقت الكلمة من المسلمين أنّ اللّٰه فوق عرشه ، فوق سماواته . ''یہ مسلمانوں کا اتفاقی مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر آسمانوں کے اوپر ہے۔'' (الرد علی بشر المريسی للدارمی : ص ۴۰۸)

اس قول کو ذکر کرنے کے بعد حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قلت : أوضح شيء في هذا الباب قوله تعالىٰ : ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ (طٰہٰ : ۵/۲۰) ، فليمرّ كما جاء ، كما هو معلوم من مذهب السّلف ، وينهى الشّخص عن المراقبة والجدال ، وتأويلات المعتزلة : ﴿ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ ﴾ (آل عمران : ۵۳/۳). ''میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں سب سے واضح ترین نص یہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ (طٰہٰ : ۵/۲۰) (رحمٰن عرش پر مستوی ہے)، یہ آیت جس طرح آئی ہے، اسی طرح اس کو رکھا جائے، جیسا کہ سلف صالحین کا مذہب معلوم ہے، نیز آدمی کو ، جدال اور معتزلہ کی تاویلات سے یہ فرمانِ الٰہی روکتا ہے: ﴿ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ ﴾ (آل عمران : ۵۳/۳)۔''

(سیر اعلام النبلاء للذهبی : ۳۲۵/۱۳)

⑤ امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ (م ۳۲۴ھ) کے بارے میں حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے

ہیں: **وكذلك أبو الحسن الأشعريّ نقل الاجماع على أنّ اللّٰه استوى على عرشه.**

''اسی طرح امام ابوالحسن الاشعری نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے۔''(مختصر الصواعق المرسلة لابن القيم : ٣١٨)

تفصیل کے لیے امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ کی کتاب **الابانة** اور **مقالات الاسلاميّين** کا مطالعہ کریں۔

⑥ امام ابوبکر الآجری رحمہ اللہ (م ٣٦٠ھ) فرماتے ہیں:

فانّي أحذّر اخواني المؤمنين مذهب الحلوليّة ، الّذي لعب بهم الشّيطان ، فخرجوا بسوء مذهبهم عن طريق أهل العلم الى مذاهب قبيحة ، لا تكون الّا في مفتون هالك . زعموا أنّ اللّٰه عزّوجلّ حالّ في كلّ شيء ، حتّى أخرجهم سوء مذهبهم الى أن تكلّموا في اللّٰه عزّوجلّ بما تنكره العلماء العقلاء ، لا يوافق قولهم كتاب ولا سنّة ولا قول الصّحابة رضي اللّٰه عنهم ولا قول أئمّة المسلمين ...

''میں اپنے مؤمن بھائیوں کو حلولیہ کے مذہب سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، جن کے ساتھ شیطان نے کھیل کھیلا اور وہ اپنے برے مذہب کی وجہ سے اہل علم کے مذہب سے نکل کر ایسے قبیح مذاہب کی طرف نکل گئے، جن کو کوئی پاگل ومجنوں شخص ہی اپنا سکتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز میں حلول کیے ہوئے ہے، یہاں تک کہ ان کے مذہب کی گندگی نے ان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کرنے پر مجبور کیا، جن کا عقل مند علمائے کرام انکار کرتے ہیں۔ نہ تو کتاب وسنت میں ان کے قول کی حمایت موجود ہے، نہ ہی صحابہ کرام اور ائمہ مسلمین کا کوئی قول ان کے موافق ہے۔''

(الشريعة للآجري : ٢٧٣/١)

⑦ الامام، المقری، المحقق، المحدث، الحافظ، الاثری، ابوعمر احمد بن محمد الطلمنکی رحمہ اللہ (م ٤٢٩ھ) اپنی کتاب ''الوصول الی معرفۃ الاصول'' میں لکھتے ہیں: **أجمع المسلمون من أهل السّنّة على أنّه معنى قوله : ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ ﴾** (الحديد :

٤/٥٧) ، ونحو ذلک من القرآن أنّه علمه ، وأنّ اللّٰه تعالیٰ فوق السّماوات بالذّات مستو علی عرشه کیف شاء . ''اہل سنت مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ ﴾ (الحدید : ٤/٥٧) (وہ اللہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو) اور اس طرح کی دوسری قرآنی آیات کا معنیٰ ہے کہ وہ اس کا علم ہے، اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر اپنی ذات کے ساتھ مستوی ہے، جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔'' (العلو للذهبی : ص ۱۷۸)

⑧ الامام، الحافظ، شیخ السنۃ، ابونصر عبید اللہ بن سعید الوائلی السجزی رحمہ اللہ (م ۴۴۴ھ) اپنی کتاب الابانۃ میں لکھتے ہیں: وأئـمّتنا کسفیان ، ومالک ، والحمّادین ، وابن عیینة ، والفضیل (ابن عیاض) ، وابن المبارک ، وأحمد بن حنبل ، واسحاق متّفقون علی أنّ اللّٰه سبحانه فوق العرش وعلمه بکلّ مکان ، وأنّه ینزل الی السّماء الدّنیا ، وأنّه یغضب ویرضی ویتکلّم بما شاء . ''ہمارے ائمہ، مثلاً سفیان (ثوری)، مالک، دونوں حماد (حماد بن سلمہ، حماد بن زید)، (سفیان) ابن عیینہ، فضیل (ابن عیاض)، (عبداللہ) ابن المبارک، احمد بن حنبل اور اسحاق رحمہم اللہ اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ عرش پر ہے اور اس کا علم ہر جگہ میں ہے، وہ (رات کو) آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، وہ غصے میں آتا، راضی ہوتا اور جو چاہے کلام کرتا ہے۔'' (سیر اعلام النبلاء للذهبی : ٦٥٦/١٧، مجموع الفتاوی لابن تیمیة : ١٩٠/٥)

⑨ الامام ابوعثمان اسماعیل بن عبد الرحمٰن الصابونی رحمہ اللہ (۳۷۳-۴۴۹ھ) فرماتے ہیں:

وعلماء الأمّة وأعیان الأئـمّة من السّلف رحمهم اللّٰه لم یختلفوا فی أنّ اللّٰه تعالیٰ علی عرشه ، وعرشه فوق سماواته ، یثبتون له من ذلک ما أثبته اللّٰه تعالیٰ ویؤمنون به ویصدّقون الرّبّ جلّ جلاله فی خبره ، ویطلقون ما أطلقه سبحانه وتعالیٰ من استوائه علی العرش ، ویمرّونه علی ظاهره ، ویکلون علمه الی اللّٰه .

''امت کے علماء اور سلف میں سے بڑے بڑے ائمہ اس بات پر متفق تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے، اس کا عرش اس کے آسمانوں کے اوپر ہے، وہ (سلف صالحین) اللہ تعالیٰ کے لیے وہ

صفات ثابت کرتے ہیں، جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ثابت کی ہیں اور وہ اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب تعالیٰ کی خبر میں اس کی تصدیق کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے مطلق چھوڑا ہے، اس کو وہ مطلق چھوڑتے ہیں، یعنی عرش پر مستوی ہونا، وہ (سلف) اس کو اس کے ظاہر پر برقرار رکھتے ہیں اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔''(عقيدة السلف أصحاب الحديث : ص ١٥-١٦)

⑩ الامام، حافظ المغرب ابوعمر ابن عبدالبر رحمہ اللہ (م۴۶۳ھ) نزولِ باری تعالیٰ کے متعلق حدیثِ ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: **وفيه دليل على أنّ الله عزّوجلّ في السّماء على العرش من فوق سبع سماوات ، كما قالت الجماعة ، وهو من حجّتهم على المعتزلة والجهميّة في قولهم : انّ الله عزّوجلّ في كلّ مكان ، وليس على العرش .** ''اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ اہل سنت والجماعت نے کہا ہے، یہ حدیث معتزلہ اور جہمیہ کے اس قول کے خلاف ان کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے، عرش پر نہیں۔''(التمهيد لابن عبد البر : ١٢٩/٧)

⑪ عالمِ ربانی، شیخ الاسلام ثانی، علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ (۶۹۱۔۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

أجمع المسلمون من الصّحابة والتّابعين أنّ الله على عرشه فوق سماواته ، بائن عن خلقه . ''صحابہ و تابعین، یعنی مسلمانوں نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر آسمانوں کے اوپر ہے، اپنی مخلوق سے جدا ہے۔''(مختصر الصواعق المرسلة : ٤١٨)

⑫ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (۷۷۳۔۸۵۲ھ) ائمہ اہل سنت کے اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کے متعلق اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: **فكيف لا يوثّق بما اتّفق عليه أهل القرون الثّلاثة ، وهم خير القرون بشهادة صاحب الشّريعة .** ''اس بات پر کیسے اعتماد نہ کیا جائے، جس پر تینوں زمانوں والوں (صحابہ، تابعین، تبع تابعین) نے اتفاق کیا ہے، یہ زمانے سب زمانوں سے بہتر ہیں کہ اس کی گواہی خود صاحبِ شریعت (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے دی ہے۔''(فتح الباري في شرح صحيح البخاري لابن حجر : ٤٠٧/١٣-٤٠٨)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت وامامت پر اجماع کے بعد قرآن وحدیث کے دلائل پیشِ خدمت ہیں: اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ... ﴾ (النور : ٥٥/٢٤)

''اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلافت عطا کی تھی، جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ضرور ان کے اس دین کو طاقت دے گا، جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور وہ ضرور ان کے خوف کے بعد امن لائے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔۔۔''

امام عبدالرحمٰن بن عبدالحمید المہری رحمہ اللہ (م۱۹۲ھ) فرماتے ہیں: أری ولایة أبی بکر وعمر رضی اللہ عنہما فی کتاب اللہ عزّوجلّ ، یقول اللہ : ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْاَرْضِ ... ﴾ (النور : ٥٥/٢٤)

''میں سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کو قرآنِ کریم میں دیکھ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْاَرْضِ ... ﴾ (النور : ٥٥/٢٤) (اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا)۔'' (تفسیر ابن ابی حاتم :۱۹۱/۱۰، وسندۂ صحیحٌ)

امام آجری رحمہ اللہ (م۳۶۰ھ) لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ ہم پر آپ پر رحم کرے!

جان لو کہ سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی رضی اللہ عنہم کی خلافت کا بیان اللہ تعالیٰ کی کتاب، سنتِ رسول، اقوالِ صحابہ اور اقوالِ تابعین میں موجود ہے، کوئی مسلمان، جسے اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے، اس میں شک نہیں کر سکتا۔ قرآنی دلیل تو یہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ... ﴾ (النور: ٢٤/٥٥) (اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلافت عطا کی تھی، جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ضرور ان کے اس دین کو طاقت دے گا، جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور وہ ضرور ان کے خوف کے بعد امن لائے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔۔۔)، اللہ تعالیٰ کی قسم ہے! اللہ تعالیٰ نے ان سے کیا ہوا اپنا یہ وعدہ پورا فرمایا اور ان کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کو خلافت اور علاقوں میں حکومت دی، انہوں نے فتوحات کیں، اموال کو غنیمت میں حاصل کیا، کافروں کے بچوں اور بیویوں کو قید کیا، ان کی خلافت میں بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے، جو لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے تھے، ان سے لڑائی کی، حتی کہ ان کو جلاوطن کر دیا، ان میں سے بعض نے رجوع کر لیا۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا، ان کی مرتدین کے خلاف تلوار تا قیامت برحق ہے، اسی طرح خلیفۂ رابع سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے، ان کی خارجیوں کے خلاف لڑائی تا قیامت برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خلافت کی وجہ سے اپنے دین کو عزت دی، دشمنوں کو ذلیل کیا اور مشرکین کے ناپسند کرنے کے باوجود اللہ کا امر غالب ہوا۔ خلفائے راشدین نے مسلمانوں کے لیے معزز طریقے چھوڑے، وہ اہل سنت والجماعت پر مشتمل تمام امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر برکت تھے۔" (الشريعة للآجري: ٥٦٤_٥٦٥)

امام بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) کہتے ہیں: وقد دلّ كتاب الله عزّ وجلّ على امامة أبي بكر ومن بعده من الخلفاء، قال الله عزّ وجلّ: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ

وَعَـمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِىْ ارْتَضَى لَهُمْ ...﴾ (النور : ٥٥/٢٤)

''سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آنے والے خلفائے راشدین کی امامت پر قرآنِ کریم کی دلیل موجود ہے، فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَعَـدَ الـلّٰـهُ الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوْا مِـنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَـخْـلِـفَنَّهُم فِيْ الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِىْ ارْتَـضَى لَهُمْ ...﴾ (النور : ٥٥/٢٤) (اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا، جیسا کہ اس نے ان لوگوں کو خلافت عطا کی تھی، جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان کے لیے ضرور ان کے اس دین کو طاقت دے گا، جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔۔۔)۔'' (الاعتقاد للبيهقي : ٤٨٣)

دلیل نمبر ①: قال الامام أبو داؤد (الطّيالسيّ) : حدّثنا الحشرج بن نباتة ، قال : حدّثني سعيد بن جهمان ، قال : حدّثني سفينة ، قال : خطبنا رسول اللّٰه صلّى اللّٰـه عليه وسلّم ، فقال : الخلافة في أمّتي ثلاثون سنة ، ثمّ يكون ملك ، ثمّ قال : سفينة : أمسك خلافة أبي بكر وخلافة عمر ثنتا عشرة سنة وستّة أشهر ، وخلافة عثمان ثنتا عشرة سنة ، ثمّ خلافة عليّ تكملة الثّلاثين ، قلت : فمعاوية ؟ قال : كان أوّل الملوك . ''سفینہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا، میری امت میں خلافت تیس سال ہوگی، پھر بادشاہت ہوگی، سفینہ نے کہا، تو شمار کر لے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت بارہ سال اور چھ ماہ تھی، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت بارہ سال تھی، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خلافت نے تیس سال پورے کر دیئے، (سعید بن جہمان کہتے ہیں) میں نے کہا، پھر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ (کا کیا معاملہ تھا)؟ فرمایا، وہ پہلے بادشاہ تھے۔'' (مسند الطيالسي : ص ١٥١، ح : ١٢٠٣، مسند الامام احمد : ٢٢١/٥، سنن الترمذي : ٢٢٢٦، وسندهٗ حسنٌ)

الحشرج بن نباتہ کی متابعت سنن ابی داؤد (٤٢٤٦) وغیرہ میں عبدالوارث بن سعید البصری (ثقہ

،ثبت) نے اور مسند احمد (٥/٢٢٠۔٢٢١) وغیرہ میں حماد بن سلمہ (ثقہ ثبت) اور سنن ابی داؤد (٤٦٤٧) میں العوام بن حوشب الواسطی نے کر رکھی ہے۔

رہا مسئلہ سعید بن جہمان کا تو جمہور نے اس کو ''توثیق'' کی ہے۔

اس کو ① امام احمد بن حنبل (السنة للخلال : ص ٤١٩)، ② امام یحییٰ بن معین (تاریخ یحیی بن معین : ٣٦٩٥)، ③ امام ابن عدی (الکامل : ٤٠٢/٣، قال : أرجوا أنّه لا بأس به)، ④ امام یعقوب بن سفیان (المعرفة والتاریخ : ٧٨/٢)، ⑤ امام ترمذی (السنن : ٢٢٢٦ بتحسین حدیثه)، ⑥ امام ابن ابی عاصم (السنة : ١٢٢٢ بتصحیح حدیثه)، ⑦ امام ابن الجارود (المنتقی : ٩٧٦ بتصحیح حدیثه)، ⑧ امام ابنِ حبان (الثقات : ٢٧٨/٤)، ⑨ امام حاکم (المستدرك : ٧١/٣ بتصحیح سنده) اور ⑩ حافظ ہیثمی (مجمع الزوائد : ٣٦٦/٩) رحمہم اللہ وغیرہم نے ''ثقہ'' کہا ہے۔

کسی ثقہ امام نے ان کو ''ضعیف'' نہیں کہا۔ مدعی پر دلیل لازم ہے!

رہا امام بخاری رحمہ اللہ (التاریخ الصغیر : ١٩٦/١) اور حافظ ساجی (تهذیب التهذیب : ١٤/٤) کا یہ کہنا کہ **لا یتابع علی حدیثه .** کہنا تو یہ مضر نہیں، کیونکہ جب یہ واضح ثقہ ہیں تو ان کی متابعت نہ ہونے میں کوئی حرج نہیں، اسی لیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس راوی کو اپنی کتاب **من تکلم فیه وهو موثق أو صالح الحدیث** (١٢٧) میں ذکر کیا ہے، لہٰذا حافظ ذہبی کا **قوم یضعّفون** (میزان الاعتدال : ١٣١/٢) کہنا بے معنیٰ ہے۔

اسی طرح امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ کا **شیخ یکتب حدیثه ولا یحتجّ به** کہنا بھی جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل التفات ہے۔

امام احمد بن حنبل (السنة للخلال : ص ٤١٩)، امام ابنِ حبان (٦٦٥٧)، امام ابنِ ابی عاصم (السنة : ١٢٢٢) اور شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ (مجموع الفتاوی : ١٨/٣٥) رحمہم اللہ نے اس حدیث کو، جبکہ امام حاکم رحمہ اللہ (المستدرك : ٧١/٣) اور بوصیری (اتحاف الخیرة : ٢٧٦/٨) نے اس کی سند کو ''صحیح'' کہا ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ (سنن ترمذی : ٢٤٢٦) اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (موافقة الخبر الخبر : ١٤٧/١) نے اس

حدیث کو ''حسن'' قرار دیا ہے۔

ساتھ ہی حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں: ''سعید بن جہمان صغیر تابعی اور صدوق راوی تھے۔''

کسی ثقہ محدث نے اس حدیث پر کلام نہیں کی، بلکہ محدثین کرام نے اس حدیث کی ''تصحیح'' کر کے اسے قبول کیا ہے، لہٰذا ابنِ خلدون مؤرخ (تاریخ ابن خلدون : ٤٥٨/٢) اور ابن العربی مالکی (العواصم من القواصم : ص ٢٠١) کا اسے بغیر دلیل کے صحیح تسلیم نہ کرنا بے وقعت ہے۔

حدیث سفینہ سے محدثین کا استدلال

① امام اہل سنت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بارے میں میمونی بیان کرتے ہیں: ''میں نے امام احمد سے سنا، ان سے سوال کیا گیا کہ آپ کا خلافت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فرمایا، ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم (ہی خلیفہ تھے)، کہا گیا، گویا کہ آپ حدیثِ سفینہ کی طرف جاتے ہیں؟ فرمایا، میں حدیثِ سفینہ کی طرف بھی جاتا ہوں اور ایک اور چیز کی طرف بھی، وہ یہ کہ میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے کہ وہ سیدنا ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دور میں امیر المؤمنین کے نام سے موسوم نہیں ہوئے، نہ ہی آپ نے جماعت و جمعہ اور حدود قائم کی ہیں، لیکن سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے یہ کام کیا ہے، معلوم ہوا کہ اس وقت آپ کے لیے وہ کام واجب ہو گیا تھا، جو پہلے واجب نہ تھا۔'' (الاعتقاد للبیہقی : ٤٦٩، وسندهٗ صحیحٌ) نیز امام موصوف فرماتے ہیں: ''خلافت کے بارے میں ہم حدیثِ سفینہ کی طرف جاتے ہیں۔'' (مسائل الامام احمد لعبد الله : ١٨٣٣)

② امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث ائمہ اربعہ کی خلافت پر دلالت کرتی ہے۔'' (ابانة عن اصول الديانة للاشعرى :٢٥١)

اسی طرح ③ امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (صحيح ابن حبان : ٦٦٥٧) ④ امام ابنِ جریر طبری رحمہ اللہ (صريح السنة : ح ٧) ⑤ امام الآجری (الشريعة : ٥٦٤) اور امام بیہقی (الاعتقاد : ٤٦٧) رحمہم اللہ بھی اس حدیث سے خلفائے اربعہ کا ہی اثبات کرتے ہیں۔

❀❀❀❀❀❀❀
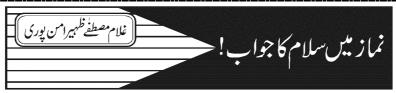
نمازی کو سلام کہنا جائز اور صحیح ہے، حالتِ نماز میں سلام کا جواب کلام کر کے نہیں، بلکہ اشارے کے ساتھ دینا سنت ہے، کلام کر کے سلام کا جواب لوٹانا منسوخ ہے۔

دلیل نمبر ① : عن جابر ، قال : أرسلني رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم ، وهو منطلق الى بني المصطلق ، فأتيته وهو يصلّي على بعيره ، فكلّمته، فقال لي بيده هكذا ، وأومأ زهير بيده ، ثمّ كلّمته ، فقال لي هكذا ، فأومأ زهير أيضا بيده نحو الأرض ، وأنا أسمعه يقرأ ، يؤمیء برأسه ، فلمّا فرغ قال : ما فعلت في الّذي أرسلتک له ؟ فانّه لم يمنعني أن أكلّمک الّا أنّي كنت أصلّي .

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بنو مصطلق کی طرف بھیجا، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر (نفلی) نماز پڑھ رہے تھے، میں نے آپ پر سلام کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کے اشارے سے جواب لوٹایا (زہیر راوی نے ہاتھ سے اشارہ کر کے دکھایا)، میں نے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا (زہیر نے اپنا ہاتھ زمین کی طرف جھکایا)، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت سن رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر کے ساتھ اشارہ فرما رہے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو فرمایا، میں نے تجھے جس کام کے لیے بھیجا تھا، اس بارے میں کیا کِیا؟ مجھے کلام کرنے سے صرف یہ بات روک رہی تھی کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔''

(صحيح بخاری : ١٢١٧، صحيح مسلم : ٥٤٠ ، واللفظ له)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نمازی کو سلام کہنے اور اس کا اشارے سے جواب لوٹانا جائز ہے۔

دلیل نمبر ② : سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

خرج رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم الى قباء يصلّي فيه ، قال : فجاء ته

الأنصار ، فسلّموا عليه وهو يصلّي ، قال : فقلت لبلال : كيف رأيت رسول الله صلّى الله عليه وسلّم يردّ عليهم حين كانوا يسلّمون عليه ، وهو يصلّي ؟ قال : يقول هكذا ، وبسط كفّه . ''نبیٔ اکرم ﷺ مسجدِ قباء میں نماز کے لیے نکلے، انصار صحابہ آئے اور انہوں نے آپ ﷺ کو سلام کہا، آپ ﷺ نماز میں تھے، سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ ﷺ حالتِ نماز میں کس طرح جواب لوٹاتے تھے؟ اس پر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی ہتھیلی پھیلائی۔ (راوی جعفر بن عون نے اپنی ہتھیلی کا باطنی حصہ نیچے کی طرف اور اس کی پشت اوپر کی طرف کی)۔''(سنن ابی داوٗد : ۹۲۷ ، سنن الترمذی : ۳٦۸ ، مسند الامام احمد : ۱۲/٦، وسندہٗ حسنٌ)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ''حسن صحیح'' کہا ہے۔ امام ابن الجارود رحمہ اللہ (۲۱۵) اور حافظ نووی رحمہ اللہ (خلاصۃ الاحکام : ۵۰۸/۱) نے ''صحیح'' قرار دیا ہے۔

دلیل نمبر ③ : عن صهيب أنّه قال : مررت برسول الله صلّى الله عليه وسلّم ، وهو يصلّي ، فسلّمت عليه ، فردّ اشارةً . ''سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا، آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے آپ ﷺ پر سلام کہا، آپ ﷺ نے اشارے کے ساتھ جواب دیا۔''(سنن ابی داوٗد : ۹۲۵ ، سنن الترمذی : ۳٦۷ ، سنن النسائی : ۱۱۸۷ ، مسند الامام احمد : ۳۳۲/٤ ، وسندہٗ صحیحٌ)

اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن'' کہا ہے، جبکہ امام ابن الجارود رحمہ اللہ (۲۱٦) اور امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (۲۲۵۹) نے ''صحیح'' قرار دیا ہے۔

اس حدیث کا ایک شاہد ''صحیح'' سند کے ساتھ سنن النسائی (۱۱۸۸)، سنن ابنِ ماجہ (۱۰۱۷) اور مسند الحمیدی (۱٤۸) وغیرہ میں موجود ہے ۔ اس کو امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (۸۸۸) اور امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (۲۲۵۸) نے ''صحیح'' کہا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ (۱۲/۳) نے اسے بخاری ومسلم کی شرط پر ''صحیح'' کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

ان احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ نمازی کو سلام کہنا اور اس کا اشارے کے ساتھ جواب لوٹانا

جائز اور درست ہے۔

دلیل نمبر ④ : **انّ عبد اللّٰہ بن عمر مرّ علی رجل ، وھو یصلّی ، فسلّم علیه ، فردّ الرّجل کلاماً ، فرجع الیه عبد اللّٰہ بن عمر ، فقال له : اذا سلّم علی أحدکم ، وھو یصلّی ، فلا یتکلّم ، ولیشر بیده .** ''سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ایک آدمی کے پاس سے گزرے، وہ نماز پڑھ رہا تھا، آپ نے اسے سلام کہا، اس نے بول کر جواب دیا، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کی طرف لوٹے اور اسے فرمایا، جب تم میں سے کسی ایک کو سلام کہا جائے اور وہ نماز پڑھ رہا ہو تو وہ کلام نہ کرے، بلکہ اپنے ہاتھ کے ساتھ اشارہ کردے۔'' (المؤطا للامام مالك : ١٦٨/١، مصنف ابن ابی شیبة : ٧٤/٢ ، ح : ٤٧٤٩، واسنادهٗ صحیح کالشمس وضوحاً)

دلیل نمبر ⑤ : **عن عطاء أنّ موسیٰ بن عبد اللّٰہ بن جمیل الجمحیّ سلّم علی ابن عبّاس ، وھو یصلّی ، فأخذه بیده .** ''عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ موسیٰ بن عبداللہ بن جمیل جمحی نے سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کو سلام کہا، آپ نماز میں تھے، آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا (یہ آپ کی طرف سے سلام کا جواب تھا)۔''

(السنن الکبریٰ للبیهقی : ٢٥٩/٢ ، مصنف ابن ابی شیبة : ٧٣/٢ ، وسندهٗ صحیحٌ)

دلیل نمبر ⑥ : **عن أبی مجلز ، سئل عن الرّجل یسلّم علیه فی الصّلاة ، قال : یردّ بشقّ رأسه الأیمن .** ''ابومجلز (لاحق بن حمید تابعی) رحمہ اللہ سے ایسے نمازی کے بارے میں سوال کیا گیا، جس کو سلام کہا جائے، آپ نے فرمایا، وہ اپنے سر کی دائیں جانب کے ساتھ (اشارہ کرتے ہوئے) جواب لوٹائے۔''

(مصنف ابن ابی شیبة : ٧٣/٢ ، ح : ٤٨٥٠ ، وسندهٗ صحیحٌ)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ان شاء أشار وأمّا بالکلام فلا یردّ .**

''نمازی اگر چاہے تو اشارے سے سلام کا جواب دے دے، لیکن زبان سے کلام کر کے جواب نہ لوٹائے۔'' (مسائل احمد لابی داوٗد : ص ٣٧، مسائل احمد لابی هانی : ٤٤/١)

تنبیه ① : امام اسحاق بن راہویہ، امام احمد بن حنبل اور امام سفیان الثوری رحمہم اللہ سے روایت ہے، ان کا قول ہے: **اذا ردّ علیه استقبل الصّلاة .** ''جب نمازی سلام کا جواب لوٹائے تو وہ از سرِ نو نماز پڑھے۔''(مسائل احمد واسحاق : ۸۳/۱)

اس قول سے ان ائمہ کی مراد یہ ہے کہ اگر کسی نمازی کو معلوم ہو کہ نماز میں زبان سے سلام کا جواب دینا ممنوع اور منسوخ ہے، اس کے باوجود وہ ایسا کرے تو اسے نماز لوٹانی ہوگی، کیونکہ اس نے جان بوجھ کر نماز میں کلام کر دی ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

تنبیه ② : اگر حالتِ نماز میں جہالت کی بنا پر بھول کر سلام کے جواب میں ''وعلیکم السلام'' کہہ دے تو نماز باطل نہیں ہوگی۔

اعتراض ① : ''حنفیہ کہتے ہیں کہ نماز میں آپ ﷺ کا اشارہ حالتِ نماز میں سلام کہنے کی ممانعت کے بارے میں تھا، نہ کہ سلام کے جواب میں۔''(شرح معانی الآثار : ۴۵۷/۱)

جواب : ان کا یہ بے دلیل قول مذکورہ بالا احادیث و آثار، جو حالتِ نماز میں اشارے سے سلام لوٹائے جانے کے بارے میں واضح ہیں، ان کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود و باطل ہے۔

اعتراض ② : **عن عبد الله رضی الله عنه ، قال : کنت أسلّم علی النّبی صلّی الله علیه وسلّم ، وهو فی الصّلاة ، فیردّ علیّ ، فلمّا رجعنا ، سلّمت علیه ، فلم یردّ علیّ ، وقال : انّ فی الصّلاة شغلاً .** ''سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو حالتِ نماز میں سلام کہہ دیا کرتا اور آپ مجھے جواب دے دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ جب ہم نجاشی کے پاس سے واپس آئے تو میں نے آپ ﷺ کو نماز میں سلام کہا، آپ ﷺ نے جواب نہ دیا، (جب یہ بات آپ ﷺ سے پوچھی گئی تو) آپ نے فرمایا، نماز میں (قرآن کی قراءت، ذکر اور دعاؤں کی) مشغولیت ہوتی ہے۔''

(صحیح بخاری : ۱۲۱۶، صحیح مسلم : ۵۳۸)

جواب : یہ حدیث دلیل ہے کہ نماز میں زبان سے سلام کا جواب لوٹانا منسوخ ہے، اس سے ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب لوٹانے کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا جواز دوسری صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

اعتراض ③ : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا غرار فی صلاۃ و لا تسلیم . ''نماز اور سلام میں نقصان نہیں ہے۔''

(سنن ابی داوٗد : ۹۲۸ ، مسند الامام احمد : ۴٦۱/۲، السنن الکبریٰ للبیہقی : ۲٦۱/۲، المستدرک للحاکم : ۲٦٤/۱)

امام حاکم نے اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر ''صحیح'' کہا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

جواب : یہ حدیث سفیان ثوری رحمہ اللہ کی ''تدلیس'' کی وجہ سے ''ضعیف'' ہے، سماع کی تصریح نہیں مل سکی۔ اگر اس کو ''صحیح'' مان بھی لیا جائے اور یہ معنیٰ کر لیا جائے کہ نماز میں نقصان اور سلام نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سلام بالتلفظ نہیں ہے۔ اشارے کے ساتھ سلام کا جواب تو صحیح احادیث، آثارِ صحابہ و تابعین سے ثابت ہے۔

اعتراض ④ : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مـن أشار فی صلاته اشارة تفهم عنه ، فلیعد لها . ''جو آدمی اپنی نماز میں ایسا اشارہ کرے، جو اس کی طرف سے سمجھ لیا جائے، وہ اپنی نماز دہرائے۔''

(سنن ابی داوٗد : ۹٤٤ ، سنن الدارقطنی : ۸۳/۲ ، شرح معانی الآثار للطحاوی : ٤٥۳/۱)

جواب : یہ حدیث ''ضعیف'' ہے، اس میں محمد بن اسحاق (حسن الحدیث، وثقہ الجمہور) مشہور ''مدلس'' ہیں، جو کہ بصیغۂ عن روایت کر رہے ہیں، سماع کی تصریح نہیں ملی، پھر یہ ''صحیح'' احادیث کے خلاف بھی ہے۔

اعتراض ⑤ : طحاوی حنفی ایک دلیل لائے ہیں کہ:

عن أبی سفیان ، قال : سمعت جابرا رضی اللّٰہ عنہ یقول : ما أحبّ أن أسلّم علی الرّجل ، وھو یصلّی ، ولو سلّم علیّ لرددتّ علیہ . ''ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے، میں نمازی پر سلام کہنا پسند نہیں کرتا، لیکن اگر اس نے مجھے سلام کہہ دیا تو میں اس کا جواب لوٹاؤں گا۔''

(شرح معانی الآثار للطحاوی : ٤٥٧/١، واسنادہٗ حسنٌ)

جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی کہتے ہیں کہ یہ ابوسفیان طریف السعدی ہے، جو کہ سخت متکلم فیہ ہے۔(اعلاء السنن : ٣٤/٥)

ہم کہتے ہیں کہ تھانوی صاحب اس راوی کے تعین میں وہم وتخلیط کا شکار ہو گئے ہیں، یہ ابوسفیان طریف السعدی نہیں، بلکہ ابوسفیان طلحہ بن نافع الواسطی ہے، جس کی جمہور نے ''توثیق'' کر رکھی ہے اور یہ ''حسن'' درجہ کا راوی ہے۔

طحاوی حنفی کہتے ہیں کہ **لرددتّ** ، یعنی میں سلام کا جواب لوٹاؤں گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے بعد لوٹاؤں گا، اس پر دلیل یہ پیش کی ہے کہ:

سأل سلیمان بن موسیٰ عطاء : أسألت جابرا عن الرّجل یسلّم علیک ، وأنت تصلّی ، فقال : لا ترد علیہ حتّی تقضی صلاتک ؟ فقال : نعم !

''سلیمان بن موسیٰ نے عطاء بن ابی رباح سے سوال کیا کہ کیا آپ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ایسے انسان کے بارے میں پوچھا ہے، جو حالتِ نماز میں آپ پر سلام کہے اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ اس پر سلام مت کہو، یہاں تک کہ نماز پوری کر لو؟ اس پر عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے فرمایا، ہاں! (میں نے سوال کیا تھا اور انہوں نے یہ جواب دیا تھا)۔(شرح معانی الآثار للطحاوی : ٤٥٧/١)

لیکن یہ روایت ''ضعیف'' ہے، اس کے ایک راوی علی بن زید کے بارے میں امام ابنِ یونس مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **تکلّموا فیہ .** ''محدثین نے اس کے بارے میں کلام

(جرح) کی ہے۔''(لسان المیزان لابن حجر : ۳۳۰/٤)

اس جرح کے برعکس اس کے بارے میں کوئی ''توثیق'' ثابت نہیں ہے۔

اعتراض ⑥ : جناب ظفر احمد تھانوی دیوبندی ''لسان المیزان'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مسلمہ بن قاسم نے اس کو ''ثقہ'' کہا ہے۔(اعلاء السنن : ۳۳/۵)

جواب : ہم کہتے ہیں کہ مسلمہ بن قاسم خود ''ضعیف'' ہے۔

(سیر اعلام النبلاء للذھبی : ۱۱۰/۱٦، میزان الاعتدال للذھبی : ۱۱۲/٤)

جو شخص تھانوی صاحب کی طرح خود ''ضعیف'' ہو، اس کا دوسرے کو ''ثقہ'' کہنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

تھانوی صاحب اس روایت کے ایک دوسرے راوی ہمام کے بارے میں لکھتے کہ یہ ہمام بن منبہ ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ یہ ہمام بن منبہ ہے؟

الحاصل : جب امام طحاوی حنفی کی بیان کردہ دلیل ''ضعیف'' ہوگئی تو ان کا بیان کردہ مفہوم و مطلب ضعیف ہوگیا۔ **لرددتّ** سے مراد ہے کہ میں اس کو سلام کا جواب اشارے سے لوٹاؤں گا، جیسا کہ حدیثِ جابر صحیح مسلم میں اور دوسری صحیح احادیث اور آثارِ صحابہ سے پتا چلتا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے زمین کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

اعتراض ⑦ : جناب تھانوی صاحب اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فلو کانت ھذہ الاشارۃ لردّ السّلام لکانت الی فوق ، لا الی الأرض .

''اگر یہ اشارہ سلام کا جواب لوٹانے کے لیے ہوتا تو اوپر کی طرف اشارہ ہوتا، نہ کہ زمین کی طرف۔''(اعلاء السنن : ۳۳/۵)

جواب : یہ کہاں لکھا ہے کہ سلام کے لیے اشارہ اوپر کی جانب ہوتا ہے، محدثین کا فہم مقدم ہوگا۔ محدثین نے اس سے وہی مسئلہ سمجھا ہے، جو ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ سلام کا جواب ہی تھا۔

اعتراض ⑧ : **عن جابر بن عبد اللّٰہ رضی اللّٰہ عنھما ، قال : بعثنی**

رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم فی حاجة له ، فانطلقت ، ثمّ رجعت ، وقد قضیتها ، فأتیت النّبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم ، فسلّمت علیه ، فلم یردّ علیّ ، فوقع فی قلبی ما اللّٰه أعلم به ، فقلت فی نفسی : لعلّ رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم وجد علیّ أنّی أبطأت علیه ، ثمّ سلّمت علیه ، فلم یردّ علیّ ، فوقع فی قلبی أشدّ من المرّة الأولیٰ ، ثمّ سلّمت علیه ، فردّ علیّ ، فقال : انّما منعنی أن أردّ علیک أنّی کنت أصلّی ، وکان علی راحلته متوجّها الی غیر القبلة .

''سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کسی کام کی غرض سے بھیجا۔ میں کام مکمل کر کے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میرے غم وحزن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، میں نے دل میں کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاخیر کی وجہ سے مجھ پر ناراض ہو گئے ہیں۔ دوبارہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہ لوٹایا، میرے دل میں پہلے سے بھی زیادہ حزن وملال پیدا ہوا۔ پھر میں نے آپ کے سلام پھیرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد کیا اور فرمایا، بے شک مجھے آپ کے سلام کا جواب دینے سے صرف نماز نے منع کیا تھا۔''

(صحیح بخاری : ۱۲۱۷، صحیح مسلم : ۵۴۰)

جناب تھانوی لکھتے ہیں: فانّه کالصّریح فی أنه صلّی اللّٰه علیه وسلّم لم یردّ علی جابر ، لا اشارة ولا لفظا ، ولو کان ردّ علیه اشارة لم یقع فی قلب جابر ما وقع ، فتقییده بالکلام غیر سدید ، وأیضا لو کان صلّی اللّٰه علیه وسلّم ردّ علیه بالاشارة لم یحتج الی الرّدّ علیه بعد الفراغ ، کما هو مذهب من یجیز الرّدّ بالاشارة ، وقد ثبت أنّه ردّ علیه بعد ما انصرف عن صلاته ، وهو المأثور من مذهب جابر ... ''اس میں گویا صراحت ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا جابر کو نہ اشارتاً جواب دیا تھا نہ ہی لفظاً۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے جواب دیا ہوتا تو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے دل میں غم وحزن پیدا نہ

ہوتا۔اس کواس بات پر مقید کرنا کہ یہ سلام کا جواب بالاشارہ تھا نہ کہ بالکلام، کوئی پختہ رائے نہیں ہے، اسی طرح اگر آپ ﷺ نے سلام کا جواب بالاشارہ لوٹایا ہوتا تو نماز سے فراغت کے بعد بالکلام سلام کا جواب لوٹانے کی کیا ضرورت تھی؟ جو اشارہ کے ساتھ سلام کا جواب لوٹانا جائز سمجھتا ہے، وہ تو ایسا نہیں کرتا۔ نبیٔ اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد سلام کا جواب لوٹایا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی مذہب ہے۔''(اعلاء السنن : ۳۳/۵)

تھانوی صاحب کی یہ کلام حقیقت پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ صحیح مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کو ہاتھ کے اشارہ سے سلام کا جواب لوٹایا ہے۔ اس سے صحیح بخاری والی روایت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ احادیث ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے دل میں غم کیوں پیدا ہوا تو حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فیحمل فی حدیث الباب ((فلم یردّ علیّ)) أی باللّفظ ، و کأنّ جابرا لم یعرف أوّلا أنّ المراد بالاشارۃ الرّدّ ، فلذلک قال : فوقع فی قلبی ما اللّٰہ أعلم بہ ، أی من الحزن . ''سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ نے مجھ پر جواب نہیں لوٹایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بالتلفظ نہیں لوٹایا، گویا کہ پہلے پہل سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کو علم نہ تھا کہ اشارے سے مراد جواب ہے، اسی لیے تو انہوں نے کہا کہ میرے دل میں وہ حزن وملال پیدا ہوا، جسے اللہ ہی جانتا ہے۔''

(فتح الباری لابن حجر : ۸۷/۳)

تھانوی صاحب کا یہ کہنا کہ جواب نہ لوٹانے کو کلام کے ساتھ مقید کرنا پختہ رائے نہیں ہے، صحیح مسلم کی حدیث اس کا ردّ کرتی ہے ، بلکہ دیگر احادیث وآثار بھی اس کی تردید کرتے ہیں ۔ باقی رہا نبیٔ اکرم ﷺ نے بعدِ نماز سلام کا جواب لوٹانے کی کیا ضرورت محسوس کی ، روایت میں واضح ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے آپ کو نماز میں اور سلام پھیرنے کے بعد دونوں کیفیتوں میں سلام کہا، حالتِ نماز میں آپ ﷺ نے سلام کا جواب اشارہ سے اور سلام پھیرنے کے بعد زبان سے بول کر فرمایا، اتنی سی بات تھانوی صاحب کو سمجھ نہ آسکی اور وہ حدیث کی تاویل کے درپے ہو گئے۔

ظفر احمد تھانوی صاحب نے یہ ذکر کیا ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ تھا کہ اگر نمازی پر سلام کہا جائے تو وہ بعدِ نماز ہی جواب دے گا، اس کے ثبوت پر جو دلیل دی ہے، وہ ''ضعیف'' ہے، جیسا کہ پیچھے اس کا بیان ہو چکا ہے۔ بالفرض تھانوی صاحب کی بات درست مان بھی لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نمازی پر سلام کہا جا سکتا ہے، اگر وہ جواب نہ دے تو کوئی حرج نہیں، اگر دے تو جائز ہے، وہ بھی بالاشارہ جواب دے سکتا ہے۔ کلام کر کے جواب دینا ممنوع ہے۔ ہم بھی نماز میں اشارے سے سلام کے جواب کو ضروری قرار نہیں دیتے، بلکہ صرف جواز کے قائل ہیں۔

اعتراض ⑨ : عن جابر بن سمرة ، قال : خرج علينا رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم ، فقال : ما لي أراكم رافعي أيديكم ، كأنّها أذناب خيل شمس ؟ اسكنوا في الصّلاة . ''سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا، کیا بات ہے کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم سرکش گھوڑوں کی دموں کی طرح اپنے ہاتھ اٹھا رہے ہو، نماز میں سکون اختیار کرو۔'' (صحیح مسلم : ٤٣٠)

اس بات پر علمائے کرام کا اجماع واتفاق ہے کہ اس حدیث کا تعلق تشہد اور سلام کے ساتھ ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی دوسری حدیث سے ثابت ہے کہ وہ نماز میں سلام پھیرتے وقت دائیں بائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرما دیا۔ نماز میں سلام کا جواب اشارے کے ساتھ لوٹانا نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت ہے۔

اگر اس حدیث سے نماز سے سلام کے جواب کے بارے میں عدمِ جواز ثابت ہوتا ہے تو تقلید پرست ان احادیث کا کیا جواب دیں گے، جن میں اشارے کا ذکر ہے۔ اگر وہ کہیں کہ اس حدیث سے نماز میں سلام بالاشارہ کی منسوخیت ثابت ہوتی ہے تو ان کا یہ قول باطل و مردود ہے، جیسا کہ گزشتہ دلائل سے ثابت ہے۔

اگر وہ کہیں کہ نماز میں اشارے سے سلام کا جواب دینا سکون کے منافی ہے تو وہ خود وتروں میں اور عیدین میں رفع الیدین کیوں کرتے ہیں؟ جو جواب ان کا ہوگا، وہی ہمارا جواب ہوگا۔

سند دین ہے، دینِ اسلام کا دارومدار اور انحصار سند پر ہے، سند ہی حدیثِ رسول ﷺ تک پہنچنے کا واحد طریقہ ہے، نیز سند احکامِ شرعی کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے۔ سند امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا خاصہ ہے، اہلحدیث اس کے وارث اور محافظ ہیں۔

اہل باطل ہمیشہ سند سے دور رہے ہیں، ان کی کتابیں اس سے خالی ہیں، ان سے سند کا مطالبہ بجلی بن کر گرتا ہے، لہٰذا جب بھی کوئی بدعتی اور ملحد آپ کو کوئی روایت پیش کرے تو آپ فوراً اس سے معتبر کتبِ حدیث سے سند، نیز راویوں کی توثیق وعدالت، اتصالِ سند، تدلیس اور اختلاط سے سند کے خالی ہونے کا مطالبہ کریں، وہ فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ کا صحیح مصداق بن جائے گا۔

سند اور محدثین

امام یزید بن زریع رحمہ اللہ (م ۱۸۲ھ) فرماتے ہیں: **لكلّ دين فرسان وفرسان هذا الدّين أصحاب الأسانيد .** ''ہر دین کے شہسوار ہوتے ہیں اور اس دین کے شہسوار سندوں والے لوگ ہیں۔'' (المدخل للحاکم: ۱۲، شرف اصحاب الحدیث للخطیب: ۸۲، وسندہٗ حسنٌ)

اس قول کی تشریح کرتے ہوئے امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (م ۳۵۴ھ) لکھتے ہیں:

فرسان هذا العلم الّذين حفظوا على المسلمين الدّين ، وهدوهم الى الصّراط المستقيم ، الّذين أكثروا قطع المفاوز والقفار ، على التّنعّم فى الدّيار والأوطان فى طلب السّنن فى الأمصار ، وجمعها بالوجل والأسفار ، والدّوران فى جميع الأفطار ، حتّى انّ أحدهم ليرحل فى الحديث الواحد الفراسخ البعيدة ، وفى الكلمة الواحدة الأيام الكثيرة ، لئلّا يدخل مضلّ فى السّنن شيئا يضلّ به ، وان فعل فهم الذّابّون عن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم ذلك الكذب ، والقائمون بنصرة الدّين ...

''اس علم کے شہسوار وہ لوگ ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کے لیے ان کے دین کو محفوظ کیا اور ان کی رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کی، وہ لوگ جنہوں نے ناز و نعمت اور اپنے علاقوں میں رہنے پر احادیثِ رسول ﷺ کی طلب میں صحرا و بیاباں طے کر کے دور دراز کے شہروں میں جانے کو ترجیح دی، انہوں نے خوف و سفر اور تمام اطراف و اکناف میں گھوم کر یہ کام کیا، حتی کہ ان میں سے کوئی ایک حدیث کی خاطر کئی کئی فرسخ اور ایک ہی کلمہ کی خاطر کئی کئی دن سفر کرتا، تا کہ کوئی گمراہ کن شخص احادیث میں ایسی چیز داخل نہ کر دے، جس کے ذریعے وہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو انہی لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اس جھوٹ کو دُور کیا، یہی لوگ دین کی نصرت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔'' (المجروحین لابن حبان : ۲۷/۱)

امام شافعی رحمہ اللہ (۱۵۰۔۲۰۴ھ) فرماتے ہیں: **مثل الّذی یطلب العلم بلا حجّة ، مثل حاطب لیل ، یحمل حزمة حطب فیھا أفعیٰ ، یلدغه وھو لا یدری . . .**

''جو شخص بغیر دلیل (سند) کے علم حاصل کرتا ہے، وہ رات کو لکڑیاں اکٹھی کرنے والے کی طرح ہے کہ وہ لکڑیوں کا وہ گٹھا جمع کرتا ہے، جس میں اژدھا ہوتا ہے، اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس کو ڈنگ دیتا ہے۔'' (المدخل للحاکم : ٤ ، وسندهٗ حسنٌ)

امام محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ (م ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں: **انّ ھذا الحدیث دین ، فانظروا عمّن تأخذوه .** ''یہ حدیث دین ہے، لہٰذا تم دیکھو کہ کس سے دین لے رہے ہو۔''

(الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۱۵/۲، وسندهٗ صحیحٌ)

شیخ الاسلام امام عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ (م ۱۸۱ھ) فرماتے ہیں: **الاسناد من الدّین ، ولو لا الاسناد لقال من شاء ما شاء .** ''سند دین ہے، اگر سند نہ ہوتی تو ہر کہنے والا، جو اس کے جی میں آتا، کہہ دیتا۔'' (مقدمة صحیح مسلم : ۹/۱ ، رقم : ۳۲، وسندهٗ صحیحٌ)

امام حاکم رحمہ اللہ (م ۴۰۵ھ) فرماتے ہیں: **لولا الاسناد وطلب ھذه الطّائفة له، وکثرة مواظبتھم علی حفظه ، لدرس منار الاسلام ، ولتمکّن أھل الالحاد**

والبدع فيه بوضع الحديث ، وقلب الأسانيد ، فانّ الأخبار اذا تعرّت عن وجود الأسانيد فيها كانت بُترا ... ''اگر سند نہ ہوتی اور محدثین کا یہ گروہ اس کو حاصل نہ کرتا اور اس کی حفاظت پر تسلسل نہ رکھتا تو اسلام کا مینار منہدم ہو جاتا اور ملحد و بدعتی لوگ حدیث کو گھڑنے اور سندوں کو بدلنے پر قادر ہو جاتے۔ احادیث جب سندوں کی وجود سے عاری ہو جائیں تو وہ ادھوری اور بے فیض ہو جاتی ہیں۔'' (معرفة علوم الحديث للحاكم : ص ٦)

نیز فرماتے ہیں: سمعت الشّيخ أبا بكر أحمد بن اسحاق الفقيه ، وهو يناظر رجلا ، فقال الشّيخ : حدّثنا فلان ، فقال له الرّجل : دعنا من حدّثنا الى متى حدّثنا ، فقال له الشّيخ : قم يا كافر ! ولا يحلّ لک أن تدخل داری بعد هٰذا ، ثمّ التفت الينا ، فقال : ما قلت قطّ لأحد لا تدخل داری الّا لهٰذا .....

''میں نے شیخ ابو بکر احمد بن اسحاق فقیہ کو ایک آدمی سے مناظرہ کرتے ہوئے سنا، شیخ نے سند پڑھی تو اس آدمی نے کہا، سند کو چھوڑو، اس پر شیخ نے کہا، اے کافر! کھڑا ہو جا، تیرے لیے اب کے بعد میرے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، میں نے اس آدمی کے سوا کبھی کسی کو اپنے گھر میں داخل ہونے سے منع نہیں کیا۔'' (معرفة علوم الحديث للحاكم : ص ٤)

ابو نصر أحمد بن سلام الفقیہ کہتے ہیں: ليس شیء أثقل على أهل الالحاد ولا أبغض اليهم من سماع الحديث وروايته باسناد ... ''ملحدین پر حدیث کو سننے اور اس کو باسند روایت کرنے سے بڑھ کر کوئی کام بھاری و مبغوض نہیں۔'' (معرفة علوم الحديث للحاكم : ص ٤ ، شرف اصحاب الحديث للخطيب : ١٥٢، وسندهٗ صحيحٌ)

نیز امام عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مثل الّذی يطلب أمر دينه بلا اسناد كمثل الّذی يرتقی السّطح بلا سُلّم . ''جو شخص اپنے دین کو بغیر سند کے حاصل کرتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے، جو چھت پر بغیر سیڑھی کے چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔''

(شرف اصحاب الحديث للخطيب : ٧٥ ، وسندهٗ صحيحٌ)

ابو سعید الحداد رحمہ اللہ کہتے ہیں: الاسناد مثل الدّرج ومثل المراقی ، فاذا زلّت

رجلک عن المرقاة سقطت ، والرّأی مثل المرج . ''اسناد سیڑھی اور اس کے زینوں کی طرح ہے، اگر آپ کا پاؤں سیڑھی سے پھسلے تو آپ گر جاتے ہیں۔ رائے تو فتنہ وفساد کی طرح ہے۔'' (شرف اصحاب الحدیث للخطیب : ٧٦، وسندهٗ حسنٌ)

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ (م ٦٤٣ھ) لکھتے ہیں: **أصل الاسناد خصّیصة فاضلة من خصائص هٰذه الأمّة ، وسنّة بالغة من السّنن المؤكّدة .** ''سند اس امت کی خصوصیات میں سے ایک زبردست خصوصیت ہے اور مؤکدہ سنتوں میں سے بلیغ سنت ہے۔''

(مقدمة ابن الصلاح : ص ٢٣١)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (م ٧٢٨ھ) فرماتے ہیں: **الاسناد من خصائص هذه الأمّة ، وهو من خصائص الاسلام ، ثمّ هو فی الاسلام من خصائص أهل السّنّة ، والرّافضة من أقلّ النّاس عناية به ، اذ كانوا لا يصدّقون الّا بما يوافق أهوائهم ، وعلامة كذبه أنّهم يخالف أهوائهم .** ''اسناد اس امت کا خاصہ ہے، اسلام کا خاصہ ہے، پھر اہل اسلام میں سے اہل سنت کا خاصہ ہے۔ اس کی طرف سب لوگوں میں سے کم توجہ رافضی کرتے ہیں، کیونکہ وہ صرف اس سند کی تصدیق کرتے ہیں، جو ان کی خواہشات کے موافق ہو اور (ان کے نزدیک) سند کے جھوٹا ہونے کے علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کی خواہشات کے خلاف ہو۔''

(منهاج السنة النبوية : ١١/٤)

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ (م ٤٥٦ھ) لکھتے ہیں: ''ثقہ کا ثقہ سے نقل کرنا، حتی کہ یہ سلسلہ اتصال کے ساتھ نبیٔ اکرم ﷺ تک پہنچ جائے، ہر ایک راوی اپنے شیخ کا نام ونسب بیان کرے، سب کی ذات اور ان کے احوال وزمان ومکان معروف ہوں .... یہ خصوصیت (سند) اللہ تعالیٰ نے باقی سب امتوں میں سے صرف مسلمانوں کو دی ہے اور اس خصوصیت کو ان کے ہاں قدیم زمانوں کے باوجود تر وتازہ وشگفتہ رکھا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے اتنے لوگ دور دراز آفاق کا سفر کرتے ہیں کہ ان کا شمار ان کا خالق ہی کرسکتا ہے۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، لہٰذا اگر ان میں سے کسی سے نقل کرنے میں ایک کلمہ کی بھی غلطی ہو جائے تو وہ ان سے بچ کر نہیں نکلتی، نہ

ہی کسی فاسق کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس میں کوئی ایک بھی من گھڑت کلمہ داخل کر سکے۔ وللہ تعالیٰ الشکر !

یھود : ارسال اور انقطاع کے ساتھ سند یہود میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے، لیکن وہ اس کے ذریعے بھی سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قریب نہیں پہنچ پاتے، بلکہ وہ موسیٰ علیہ السلام سے اتنا دور رُک جاتے ہیں کہ ان کے درمیان تیس زمانوں سے بھی زیادہ اور پندرہ سو سال سے بھی زیادہ عرصے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ وہ صرف شمعون وغیرہ تک پہنچ پاتے ہیں۔

نصاریٰ : رہے نصاریٰ تو ان کے پاس اس میں سے صرف طلاق کی حرمت کا فتویٰ ہے، پھر اس کا بیان کرنے والا بھی ایسا کذاب آدمی ہے، جس کا جھوٹ واضح ہے۔ کذاب اور مجہول راویوں پر مشتمل سندیں یہود و نصاریٰ کے ہاں بہت ہیں۔

رہے اقوالِ صحابہ و تابعین تو یہودی اپنے نبی کے کسی صحابی یا تابعی تک قطعاً سند نہیں پہنچا سکتے، نہ ہی نصاریٰ کے لیے ممکن ہے کہ وہ شمعون اور پولس سے آگے جائیں۔۔۔''

(الفصل فی الملل والاهواء والنحل : ۸۲/۲ـ۸۵)

❀❀❀❀❀❀❀

دعا ہو تو ایسی!

حافظ محمد اعجاز ساقی

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آیا، آپ ﷺ نے اپنی تمام ازواجِ مطہرات کی طرف کھانے کے لیے پیغام بھیجا، لیکن کسی کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا، اس پر آپ ﷺ نے یہ دعا کی:

اَللّٰهَمَّ اِنِّیْ أَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ وَرَحْمَتِکَ ، فَاِنَّهٗ لَا یَمْلِکُهُمَا اِلَّا أَنْتَ .

''اے اللہ! میں تجھ سے تیرے فضل اور تیری رحمت کا سوالی ہوں، ان دونوں کا مالک تو ہی ہے۔''

دعا کرنے کی دیر تھی کہ ایک بھنی ہوئی بکری آپ ﷺ کو تحفہ میں بھیج دی گئی، آپ ﷺ نے فرمایا، یہ تو اللہ کا فضل ہے، رحمت کے ابھی ہم منتظر ہیں۔ (المعجم الکبیر للطبرانی : ۱۷۸/۱۰، وسندهٗ صحیحٌ)

❀❀❀❀❀❀❀

سوال : کیا امام کی نماز فاسد ہونے سے مقتدی کی نماز فاسد ہو جاتی ہے؟

جواب : اگر امام بے وضو یا جنبی ہو یا اس کے کپڑوں پر نجاست لگی ہو اور اس طرح وہ نماز پڑھا دے تو مقتدیوں کی نماز بالکل صحیح اور درست ہے، البتہ امام کے لیے نماز دہرانا ضروری ہے، جیسا کہ:

دلیل نمبر ① : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يصلّون لكم ، فان أصابوا فلكم ولهم ، وان أخطؤوا فلكم وعليهم .

''وہ (حکمران) تمہیں نمازیں پڑھائیں گے، اگر وہ درست پڑھیں گے تو تمہارے لیے بھی ذریعہ نجات ہوگی اور ان کے لیے بھی، لیکن اگر وہ غلطی کریں تو تمہارے لیے ذریعہ نجات اور ان کے خلاف وبال بن جائے گی۔''

(مسند الامام احمد : ٣٥٥/٢، واللفظ له ، صحيح بخارى : ٩٦/١، ح : ٦٩٤)

حافظ بغوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **فيه دليل على أنّه اذا صلّى بقوم ، وكان جنبا أو محدثا أنّ صلاة القوم صحيحة ، وعلى الامام اعادة ، سواء كان الامام عالما بحدثه متعمّد الامامة أو كان جاهلا ...** ''اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ امام جب لوگوں کو نماز پڑھائے اور وہ جنبی یا بے وضو ہو تو لوگوں کی نماز صحیح ہوگی، امام پر نماز دہرانا ضروری ہوگا، خواہ اسے اپنے بے وضو ہونے کا علم ہو اور جانتے بوجھتے امامت کروا رہا ہو یا وہ لاعلم ہو۔'' (شرح السنة : ٤٠٥/٣)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سيأتي أقوام أو يكون أقوام يصلّون الصّلاة ، فان أتمّوا فلكم ولهم ، وان نقصوا فعليهم ولكم . ''عنقریب کچھ لوگ (حکمران) آئیں گے، وہ نمازیں پڑھائیں گے، اگر وہ

پوری نماز ادا کریں تو تمہارے لیے بھی کافی اور ان کے لیے بھی، لیکن اگر وہ کوتاہی کریں گے تو ان کے لیے وبال اور تمہارے لیے کافی ہوں گی۔'' (صحیح ابن حبان : ۲۲۲۸، وسندہٗ حسنٌ)

اس کا راوی عبداللہ بن علی الافریقی ''حسن الحدیث'' ہے۔

1۔ عباس الدوری کہتے ہیں کہ میں نے امام یحییٰ بن معین سے پوچھا، کیا یہ ثقہ ہے تو آپ نے فرمایا: **نعم ! لیس به بأس .** ''ہاں! اس میں کوئی خرابی نہیں'' (تاریخ یحیی بن معین : ۵۳۳۱)

2۔ امام ابنِ حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **من ثقات أهل الكوفة .** ''یہ ثقہ کوفیوں میں سے ہے۔'' (صحیح ابن حبان ، تحت حدیث : ۲۲۲۲۸)

❁ امام ابوزرعہ الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: **لیس بالمتین ، فی حدیثه انکار ، هو لیّن .** ''یہ مضبوط راوی نہیں، اس کی حدیث میں نکارت ہے، یہ کمزور ہے۔'' (الجرح والتعدیل : ۱۱۶/۵)

یہ قول جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔

امام ابن المنذر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **هذا الحدیث یدلّ علی اغفال من زعم أنّ صلاة الامام اذا فسدت فسدت صلاة من خلفه .** ''یہ حدیث بتاتی ہے کہ وہ شخص غلطی پر ہے، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جب امام کی نماز فاسد ہو جائے تو اس کے مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی۔'' (الاوسط فی السنن والاجماع والاختلاف لابن المنذر : ۱٦٤/٤)

دلیل نمبر ② : ابو علی الہمدانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں سفر کے لیے نکلا، ہمارے ساتھ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ہم نے آپ رضی اللہ عنہ سے کہا، اللہ آپ پر رحم کرے! آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں، آپ ہماری امامت کریں، اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، نہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: **من أمّ النّاس ، فأصاب الوقت وأتمّ الصّلاة فله ولهم ، ومن انتقص من ذٰلک شیئا فعلیه ولا علیهم .** ''جو آدمی لوگوں کی امامت کرے، وقت کو پائے اور کامل نماز پڑھے تو اس کے لیے بھی کافی اور ان کے لیے بھی کافی ہوگی اور جو اس میں کچھ کوتاہی کرے، اس کے خلاف وبال ہوگی، جبکہ مقتدیوں کے لیے کافی ہوگی۔'' (مسند الامام احمد :

٤/١٤٥، ١٥٤، ١٥٦، ٢٠١، سنن ابی داوٗد : ٥٨٠، سنن ابن ماجه : ٩٨٣، وسندهٗ حسنٌ)

اس حدیث کو امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (١٥١٣)، امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (٢٢٢١) اور امام حاکم رحمہ اللہ (١/٢١٠، ٢١٣) نے ''صحیح'' کہا ہے۔

عبدالرحمٰن بن حرملہ نے اس روایت میں ابوعلی الہمدانی سے سماع کی تصریح کر رکھی ہے۔

(السنن الکبریٰ للبیهقی : ٣/١٢٧)

نیز عبدالرحمٰن بن حرملہ المدنی جمہور محدثین کے نزدیک ''حسن الحدیث'' ہیں۔

موثقین : ① امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کہتے ہیں: **ثقة ، روی عنه یحیی القطّان نحو من مأة حدیث .** ''یہ ثقہ راوی ہیں، ان سے یحییٰ القطان نے تقریباً سو احادیث روایت کی ہیں۔'' (الکامل لابن عدی : ٤/٣١٠، وسندهٗ صحیحٌ)

② امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **لا بأس به .** ''ان میں کوئی خرابی نہیں۔''

③ ابنِ نمیر نے ''ثقہ'' کہا ہے۔ (تهذیب التهذیب لابن حجر : ٦/١٤٧)

④ امام ساجی کہتے ہیں: **صدوق ، یهم فی الحدیث .** ''سچے ہیں، حدیث میں (کبھی) وہم کھا جاتے ہیں۔'' (تهذیب التهذیب : ٦/١٤٧)

⑤ امام ابنِ عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ولم أر فی حدیثه حدیثا منکرا .**
''میں نے ان کی حدیث میں کوئی منکر حدیث نہیں پائی۔'' (الکامل لابن عدی : ٤/٣١١)

⑥ امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے انہیں ''الثقات'' میں ذکر کیا اور فرمایا ہے: **کان یخطیء .**
''یہ غلطیاں کرتے تھے۔'' امام صاحب کا یہ قول جمہور کی توثیق کے مقابلہ میں ناقابل التفات ہے۔ خود امام ابنِ حبان رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کی ''تصحیح'' کر کے رجوع ثابت کیا ہے۔

⑦ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے یزید بن عبداللہ بن قسیط (ثقہ) اور ابنِ حرملہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: **ما أقربهما .** ''یہ دونوں کتنے قریب ہیں۔''

⑧ امام مسلم رحمہ اللہ نے ان سے متابعتاً راویت لی ہے۔

⑨، ⑩ امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (١٥١٣) اور امام حاکم رحمہ اللہ (١/٢١٠) نے اس کی حدیث کی ''تصحیح'' کی

ہے۔ یہ ضمنی ''توثیق'' ہے۔ تلك عشرة كاملة ! (یہ پوری دس توثیقیں ہیں!)

جارحین : ① امام یحییٰ بن سعید القطان رحمہ اللہ کے بارے میں ہے کہ:

فضعّفه ، ولم يدفعه . ''انہوں نے انہیں ضعیف کہا، لیکن بالکل چھوڑا نہیں۔''

(الجرح والتعديل لابن ابی حاتم : ۲۲۳/۵)

اوّلاً : یہ قول جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے نا قابل التفات ہے۔

ثانیاً : اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ نہیں ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ امام یحییٰ بن سعید القطان خود فرماتے ہیں: **محمد بن عمرو أحب اليّ من ابن حرملة .** ''محمد بن عمرو بن علقمہ مجھے ابنِ حرملہ سے زیادہ محبوب ہے۔'' (الجرح والتعديل : ۲۲۳/۵، وسندهٗ صحيحٌ)

محمد بن عمرو بن علقمہ امام یحییٰ بن سعید القطان کے نزدیک ''ثقہ'' ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **فراددتّ يحيٰى فى ابن حرملة ، فقال : ليس هو عندى مثل يحيٰى بن سعيد الانصارىّ .** ''میں نے ابنِ حرملہ کے بارے میں امام یحییٰ القطان سے رجوع کیا تو انہوں نے فرمایا، میرے نزدیک وہ یحییٰ بن سعید انصاری جیسا (بڑا امام) نہیں ہے۔'' (الجرح والتعديل لابن ابی حاتم : ۲۲۳/۵)

ثالثاً : اس قول سے راوی کی عدالت ختم نہیں ہوگی، کیونکہ امام یحییٰ بن سعید القطان خود اس سے روایات لیتے ہیں، لہٰذا یہ قول ان کے نزدیک حافظے کے ''ضعف'' پر محمول کریں گے۔

رابعاً : یہ بھی احتمال ہے کہ یہ قول امام یحییٰ بن سعید القطان کے نزدیک منسوخ ہو، دیگر الفاظ اس کے ناسخ ہوں۔

خامساً : امام یحییٰ بن سعید القطان نقدِ رجال میں بہت زیادہ سختی سے کام لیتے تھے، جیسا کہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **كان يحيٰى بن سعيد متعنّتا فى نقد الرّجال ، فاذا رأيته قد وثّق شيخا ، فاعتمد عليه ، أمّا اذا ليّن أحدا فتأنّ فى أمره حتّى ترى قول غيره فيه ، فقد ليّن مثل اسرائيل وهمام وجماعة احتجّ بهم الشّيخان ...** ''امام یحییٰ بن سعید نقدِ

رجال میں بہت سخت تھے، جب آپ دیکھیں کہ انہوں نے کسی شیخ نے ثقہ کہا ہے تو ان پر اعتماد کر لیں، لیکن جب وہ کسی کو کمزور قرار دیں تو اس کے بارے میں غور وفکر کریں، حتی کہ اس کے بارے میں دوسرے محدثین کے اقوال دیکھ لیں، کیونکہ انہوں نے اسرائیل، ہمام اور بہت سے ان راویوں کو بھی کمزور قرار دے چھوڑا ہے، جن سے بخاری ومسلم نے حجت لی ہے۔'' (سیر اعلام النبلاء : ۵۵۸/۹)

② امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: **یکتب حدیثه ، ولا یحتجّ به .**

''ان کی حدیث لکھی جائے گی، ان کی حدیث میں کبھی اضطراب بھی ہوتا ہے۔'' (الجرح : ۲۲۳/۵)

کسی راوی کی حدیث میں اضطراب اس کے لیے ضعف کا سبب نہیں، نیز جمہور نے عبدالرحمٰن بن حرملہ کی روایت کی ''تصحیح'' کر کے ثابت کر دیا ہے کہ یہ مضطرب نہیں ہے، پھر امام ابوحاتم الرازی کی عادت ہے کہ اسی قسم کے الفاظ بخاری ومسلم کے ثقہ راویوں کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں۔

(دیکھیں سیر اعلام النبلاء للذھبی : ۲۶۰/۳)

③ حافظ منذری رحمہ اللہ نے لکھا ہے: **لیّنه البخاریّ .** ''امام بخاری رحمہ اللہ نے انہیں کمزور قرار دیا ہے۔'' (الترغیب والترھیب للمنذری)

امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ قول عبدالرحمٰن بن حرملہ الاسلمی کے بارے میں نہیں، بلکہ عبدالرحمٰن بن حرملہ عم القاسم بن حسان کے بارے میں ہے، لہٰذا ان پر کلام غیر مؤثر ہے، کیونکہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے انہیں اپنی کتاب **من تُكُلِّمَ فيه وهو موثّق أو صالح الحديث** میں ذکر کیا ہے۔

امام ابنِ خزیمہ رحمہ اللہ (م ۳۱۱ھ) اس حدیث پر یوں تبویب کرتے ہیں: **والدّليل على أنّ صلاة الامام قد تكون ناقصة وصلاة المأموم تامّة ، ضدّ قول من زعم أنّ صلاة المأموم متّصلة بصلاة امامه ، اذا فسدت صلاة الامام فسدت صلاة المأموم ...**

''یہ حدیث دلیل ہے کہ بسا اوقات امام کی نماز ناقص اور مقتدی کی کامل ہوتی ہے، (یہ حدیث) اس شخص کے خلاف ہے جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ متصل ہے، اگر امام کی نماز فاسد ہوگی تو مقتدی کی بھی فاسد ہو جائے گی۔۔۔'' (صحیح ابن خزیمة : ۱۵۱۳)

اعتراض نمبر ⑦ : قارئین کرام !تحویل قبلہ والی احادیث کی رو سے سورۂ بقرہ کی آیتِ کریمہ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾(١٤٤) کا ترجمہ یوں ہوتا ہے کہ ''اے نبی! ہم ضرور آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے ہیں، چنانچہ آپ اپنا چہرہ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیں۔''

اس پر اعتراض کرتے ہوئے میرٹھی صاحب کہتے ہیں: ''لیکن یہ مطلب عربیت کے لحاظ سے غلط ہے، اگر قِبْلَةً تَرْضَاهَا سے پہلے لفظ الی یا اور کوئی لفظ جو سمت و جہت کے معنیٰ پر دلالت کرے، ہوتا تو یہ مطلب صحیح ہوتا، توضیح اس کی یہ ہے کہ فعل وَلّی ، یُوَلِّیْ کے لغتِ عرب میں دو معنیٰ آتے ہیں:

① والی و حاکم بنا دینا: اس معنیٰ میں اس کا استعمال متعدی بدو مفعول ہوتا ہے اور دونوں منصوب ہوا کرتے ہیں، جیسے ولّی السّلطانُ فلاناً تلکَ القریَة (سلطان نے فلاں شخص کو اس بستی کا والی بنا دیا)

② پھیر دینا: اس معنیٰ میں اس کا استعمال ہو تو وہ چیز جس کی طرف پھیر دینے کا ذکر ہو سمت و جہت پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے، جیسے الی یا نحو یا شطر یا قِبَل یا تِلقاء جیسے ولّیتُ زیدًا الی ذاک المکان (میں نے زید کو اس جگہ کی طرف پھیر دیا) اور جس چیز سے پھیر دینے کا ذکر ہو اُسے عَنْ کے ساتھ لایا جاتا ہے، جیسے ولّیتُ زیدًا عن الشّمال نحو الجنوب (میں نے زید کو شمال سے جنوب کی طرف پھیر دیا) اس معنیٰ میں اس کا استعمال متعدی بدو مفعول ہو کر نہیں ہوتا۔ لہٰذا فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا کا یہ ترجمہ غلط ہے کہ ہم ضرور ضرور تجھے تیرے پسندیدہ قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ اس کا صحیح و درست ترجمہ یہ ہے کہ ہم ضرور

ضرور تجھے والی بنادیں گے اس قبلہ کا جسے تو نے (ہمارے حکم سے) اختیار کر رکھا ہے۔۔۔''

(«صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱/۴۵۔۳۵)

جواب: ① یہ اعتراض میرٹھی صاحب کے لغت سے جاہل ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے، ان کا کہنا ہے کہ ولّی یولّی کا معنیٰ پھیرنا ایک شرط کے ساتھ ہوتا ہے، وہ شرط آپ انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں: ''پھیر دینا، اس معنیٰ میں اس کا استعمال ہو تو وہ چیز جس کی طرف پھیر دینے کا ذکر ہو، سمت و جہت پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے۔۔۔''(«صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱/۳۶)

لیکن میرٹھی صاحب نے لفظِ قِبْـلَةً پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا اپنا معنیٰ ہی ''جہت وسمت'' ہے، چنانچہ عربی کی مشہور و معروف اور معتبر لغت تاج العروس وغیرہ میں لکھا ہے:

القبلة في الأصل : الجهة ، يقال : ما لكلامه قبلة ، أي : جهة ...

''قبلہ (سے مراد) دراصل جہت وسمت ہے، کہا جاتا ہے کہ ما لکلامه قبلة (اس کی کلام کا کوئی قبلہ نہیں، یعنی اس کی کوئی سمت نہیں)۔''(تاج العروس ، مادة : قبل)

اب قارئین خود انصاف فرمائیں کہ فعل کے بعد واقع ہونے والی چیز اگر سمت و جہت کے معنیٰ والے کسی لفظ کے ساتھ مل کر آئے تو اس فعل کا معنیٰ ''پھیر دینا'' ہوگا، لیکن اگر اس کا اپنا ذاتی معنیٰ ہی ''سمت و جہت'' ہو تو اس کا معنیٰ ''پھیر دینا'' کیوں نہیں ہوگا؟

خود ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کرو ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی!

اب میرٹھی صاحب کے ہمنوا ہی بتائیں کہ احادیثِ صحیحہ جو کہ لغتِ عرب کے عین مطابق ہیں، ان کے مطابق ترجمہ کر کے محدثین و مفسرین نے کون سی غلطی کی ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے یہ فتوی داغ دیا ہے کہ: ''یہ مطلب عربیت کے لحاظ سے غلط ہے۔''(«صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱/۳۶)

یہ تو معنیٰ و مطلب کی بات ہے، ہمارے گزشتہ مضامین میں تو یہ حقیقت بھی قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ میرٹھی صاحب کو قرآنِ کریم (آل عمران : ۱۶۷) میں موجود الفاظ بھی عربیت کے لحاظ سے غلط نظر

آ جاتے ہیں۔(دیکھیں «صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۷۳/۱) أعاذنا الله من هذه الخرافات !

پھر خود انہوں نے اس آیت کے ترجمہ میں تَرْضَاهَا کا معنیٰ ''جسے تو نے (ہمارے حکم سے) اختیار رکھا ہے'' کیا ہے، جو کہ واضح طور پر تحریفِ معنوی ہے، منکرینِ حدیث بتائیں کہ یہ معنیٰ کس لغت کے اعتبار سے کیا گیا ہے؟ تَرْضٰی مضارع کا صیغہ ہے، ماضی کا نہیں کہ اس کا معنیٰ ''اختیار کر رکھا ہے'' کر دیا جائے۔ اصل معنیٰ یہ تھا کہ ''ہم آپ کو ضرور اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جسے آپ پسند کرتے ہیں'' جیسا کہ امام ابنِ جریر رحمہ اللہ کی زبانی بتایا جا چکا ہے، انکارِ حدیث نے ان کو عقل و نقل دونوں کے خلاف معنیٰ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

یہ ہے لغتِ عرب میں میرٹھی صاحب کا مبلغِ علم اور ان کو اعتراض ہے امت کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر!

② تمام محدثین و مفسرین نے اس آیت کا یہی معنیٰ کیا ہے، میرٹھی صاحب سے پہلے اس ترجمہ کو کسی محدث و مفسر نے غلط قرار نہیں دیا، امام ابنِ جریر طبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں:

فأمّا قوله : فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ، فانّه يعني : فلنصرّفنّك عن بيت المقدّس الى قبلة ترضاها ، تهواها وتحبّها . ''اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم ضرور آپ کو بیت المقدس سے اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے اور چاہتے اور اس سے محبت رکھتے ہیں۔''(تفسیر طبری : ۱۷۵/۲)

بڑے بڑے لغوی مفسرین نے بھی اس معنیٰ کو غلط قرار نہیں دیا، بلکہ زمخشری، خازن، بیضاوی، ثعلبی، رازی وغیرہ جو کہ لغتِ عرب کے ماہرین ہیں، سب کے بیک زبان اس معنیٰ کو صحیح قرار دیا ہے۔

اب سوال ہے کہ کیا قریباً چودہ سو سال تک مسلمان لغتِ عرب سے جاہل رہے، کسی کو بھی اس کی سمجھ نہ آسکی، مسلمانوں کے اسلاف کے بارے میں ایسے نظریات رکھنے والا شخص بھلا کیسا مسلمان ہوگا؟

اعتراض نمبر ⑧ : سننِ ابنِ ماجہ کی روایت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ روایت غلط بیانیوں اور فضول باتوں کی بے ہودہ معجون ہے اور اس کی دلیل ہے کہ عموماً رایانِ

حدیث عقل وفہم سے بے بہرہ تھے، نقل کرنے کے لیے عقل کی ضرورت کے قائل نہ تھے۔۔۔ یہ بات نقل کرتے ہوئے نہ ابنِ ماجہ نے کچھ عقل سے کام لیا، نہ ان کے شیخ علقمہ بن عمرو دارمی نے، نہ ان کے شیخ ابوبکر بن عیاش نے۔۔۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ»: ۱/۳۷۔۳۸)

جواب: قارئین کرام! صحیح بخاری پر اعتراضات کے ضمن میں سنن ابنِ ماجہ کی ایک ''ضعیف'' روایت کو نشانہ بنا کر ائمہ دین، محدثین اور تمام راویانِ حدیث کو عقل سے بے بہرہ قرار دینا انتہائی فضول بکواس، بے وقوفی کی معراج اور انصاف کا خون کرنے والی بات ہے، میرٹھی صاحب کی عقل نے اتنا بھی کام نہیں کیا کہ سنن ابنِ ماجہ کی اس ''ضعیف'' روایت کا صحیح بخاری پر اعتراضات سے کیا تعلق ہے؟ اس روایت کو حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے شاذ (ضعیف) قرار دیا ہے۔

(فتح الباری لابن حجر: ۱/۹۷)

پھر ہم گزشتہ تحقیق سے یہ بات ثابت کر آئے ہیں کہ امام ابواسحاق السبیعی آخری عمر میں اختلاط کا شکار ہو گئے تھے اور اختلاط سے پہلے ان سے ان کے صرف تین شاگردوں امام سفیان ثوری، امام شعبہ اور اسرائیل رحمہم اللہ کا سماع ثابت ہے۔

اصولِ حدیث کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ ایسے راوی کی صرف وہ احادیث ''صحیح'' ہوں گی، جو اس سے اختلاط سے پہلے سننے والے شاگرد بیان کریں، جب کہ معلوم ہے کہ ابوبکر بن عیاش کا ابواسحاق سے قبل الاختلاط سننا ثابت نہیں ہے، لہٰذا یہ روایت ''ضعیف'' ہے۔

محدثین، جو کہ حقیقی طور پر اولیاء اللہ ہیں، ان کے خلاف اس ''شاذ'' روایت کو بنیاد بنا کر جو منکرِ حدیث صاحب نے ہرزہ سرائی کی ہے، ہمیں اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، اس کا شکوہ ہم اللہ ہی سے کرتے ہیں:

الٰہی! تو جانتا ہے کہ تیرے دین کے ان محافظ محدثین سے ہمیں کتنی محبت ہے! ہم سے ان کے خلاف ایسی بکواسات برداشت نہیں ہو پاتیں! اگر تیرے علم کے مطابق ان منکرینِ حدیث کی قسمت میں ہدایت نہیں تو تُو ان کی ایسی بکواسات پر خود ان سے نمٹ لے!

انکار حدیث سے انکار قرآن تک

قارئین کرام! ہم پہلے بھی یہ بات بتا چکے ہیں کہ انکارِ حدیث دراصل انکارِ قرآن ہے، اس کی کئی مثالیں آپ میرٹھی صاحب کی کلام سے ملاحظہ فرما چکے ہیں، ان کی طرف سے انکارِ قرآن کی ایک اور مثال پیشِ خدمت ہے، لکھتے ہیں: ''پھر اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہوئے اپنے چہرے کو آسمان میں بہت الٹتے پلٹتے رہتے تھے، کیا یہ ممکن ہے کہ زمین پر کھڑا یا بیٹھا ہوا کوئی انسان خواہ وہ اللہ کا نبی ہی کیوں نہ ہو، آسمان میں اپنا چہرہ الٹے پلٹے؟''

(«صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۳۸/۱)

میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض حدیث پر نہیں، بلکہ قرآنِ کریم پر ہے، کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ اصولِ محدثین کے مطابق یہ روایت ثابت ہی نہیں، البتہ منکرینِ حدیث نے اس پر اعتراض کر کے اپنی عقبیٰ خراب کر لی ہے، وہ اس طرح کہ بالکل یہی بات قرآنِ کریم میں موجود ہے، پہلے آپ اس روایت کے الفاظ پڑھیں: **وكان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم اذا صلّى الى بيت المقدّس أكثر تَقَلُّبَ وَجْهِهِ فِي السَّمَاءِ** .. یہ الفاظ ہم نے میرٹھی صاحب کی کتاب سے ہی نقل کیے ہیں۔

دیکھیں («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱/۳۶۔۳۷)

جبکہ محض ضمیر غائب کی جگہ پر مخاطب کی ضمیر کے فرق کے ساتھ یہ الفاظ قرآنِ کریم میں بھی موجود ہیں، فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ﴾(البقرة : ١٤٤)

سچ کہتے ہیں کہ چاند پر تھوکنے والا چاند کا کچھ نہیں بگاڑتا، بلکہ وہ تھوک خود اس کے منہ پر گرتا ہے، لہٰذا جو اعتراض جناب نے بے وقوفی کی وجہ سے حدیث پر کرنے کی کوشش کی تھی، وہ خود قرآنِ کریم کی گستاخی ثابت ہو کر تا قیامت ان کی جہالت و بے وقوفی پر مہر ثبت ہو گیا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں سے یہ الفاظ میرٹھی صاحب اپنی کتاب میں بارہا پیش کر چکے ہیں، لیکن حدیث پر اعتراض کرتے ہوئے ان کے دماغ نے کام چھوڑ دیا تھا۔

اعتراض نمبر ⑨ : تفسیر ابنِ کثیر میں موجود امام محمد بن اسحٰق کی روایت نقل

کرنے کے بعد لکھتے ہیں:　　"اس روایت میں یہ ہرزہ سرائیاں کی گئی ہیں:

① تقلّب وجه کا معنیٰ بکثرت دیکھنا اور فِی السَّمَاء کو اِلَی السَّمَاءِ کے معنیٰ میں بتایا ہے اور نہایت افسوس کی بات ہے کہ مترجمین نے ابنِ اسحٰق کی روایت کے مطابق ہی آیتِ شریفہ کا غلط سلط ترجمہ کر ڈالا اور وہی ترجمہ ومطلب لوگوں میں معروف ہو چکا ہے۔ آیتِ شریفہ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِیْ السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:

(اے نبی! ہم تیرے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، پس ہم یقیناً تجھے اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے)

اس ترجمہ میں تین فاش وصریح غلطیاں ہیں، اول یہ کہ تقلّب وجه کے معنیٰ نہ بکثرت دیکھنا ہیں، نہ چہرہ اوپر اٹھانا۔ منثور ومنظوم کلامِ عرب سے تقلّب وجه کے اس معنیٰ کا سراغ نہیں لگ سکتا، تقلّب وجه کے یہ معنیٰ بتانا اتنا ہی غلط ہے، جتنا یہ غلط ہے کہ کوئی شخص اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے معنیٰ یہ بتائے کہ حضرت نوح کی عمر پندرہ سو سال ہوئی تھی۔ لغتِ عرب میں تقلّب الٹنے پلٹنے اور کروٹ بدلنے کے معنیٰ میں ہے اور تقلّب وجه (چہرے کا الٹنا پلٹنا) کنایہ ہے بے چینی اور قلق واضطراب سے۔

دوم یہ کہ فِی السَّمَاء کا صحیح ترجمہ ہے "آسمان میں" اس کا ترجمہ "آسمان کی طرف" کرنا قطعاً غلط ہے، یہ ترجمہ اِلَی السَّمَاءِ کا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ آیتِ شریفہ میں اِلَی السَّمَاءِ نہیں، بلکہ فِی السَّمَاء ہے، نیز مترجمین نے فِی السَّمَاء کو تقلب سے متعلق سمجھ لیا ہے، حالانکہ اس کا تعلق فعل نَرٰی سے ہے، سوم یہ کہ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً کا ترجمہ یہ کرنا کہ "ہم یقیناً تجھے قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے" غلط ہے۔۔۔" («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱/۴۰۔۴۱)

جواب: ① یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہی نہیں، خود میرٹھی صاحب نے اسے تفسیر ابنِ کثیر کے حوالے سے بیان کیا ہے، کیا کسی نے آج تک یہ دعوی کیا ہے کہ تفسیر ابنِ کثیر کی تمام احادیث صحیح ہیں؟ اگر میرٹھی صاحب اپنی کتاب کے ٹائٹل کو ہی غور سے دیکھ لیتے تو شاید ایسا نہ کرتے!

اب قارئین ہی بتائیں کہ ان کی اس بے اصولی کو فضول ورق کالے کرنے کے سوا کیا نام دیا جائے؟ لہٰذا اس روایت پر ان کے فضول و بے کار اعتراضات کا جواب دے کر ہم اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔

② رہا آیتِ کریمہ کے ترجمہ پر اعتراض تو عرض ہے کہ یہ ترجمہ اس حدیث کی وجہ سے نہیں ، بلکہ دوسری صحیح احادیث اور لغتِ عرب کی بنا پر کیا گیا ہے، آیئے عربی دان لوگوں کی زبانی اس کی وضاحت کرتے ہیں:

امام قتادہ بن دعامہ تابعی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: **كان صلّى الله عليه وسلم يقلّب وجهه في السّماء ، يحبّ أن يصرّفه الله عزّ وجلّ الى الكعبة ، حتّى صرّفه الله اليها .** ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرہ مبارک کو آسمان کی طرف پھیرتے تھے، خواہش یہ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ ان کا قبلہ کعبہ کی طرف پھیر دے، حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کعبہ کی طرف پھیر دیا۔'' (تفسیر طبری : ۱۷۲/۳، وسندهٗ صحیح)

یاد رہے کہ امام قتادہ رحمہ اللہ وہ عظیم تابعی ہیں ، جن کے بارے میں امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **عالم بتفسير القرآن .** ''آپ رحمہ اللہ تفسیرِ قرآن کے عالم تھے۔''

(الجرح والتعديل لابن ابی حاتم : ۱۳٤/۷)

امام طبری رحمہ اللہ کے بارے میں مؤرّخِ اسلام حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

كان ثقة ، صادقا ، حافظا ، رأسا في التّفسير ، اماما في الفقه ، والاجماع والخلاف ، علّامة في التّاريخ وأيّام النّاس ، عارفا بالقراءات وباللّغة وغير ذلك ..

''آپ (امام ابنِ جریر) رحمہ اللہ ثقہ، صادق اور حافظ تھے، نیز تفسیر، فقہ، اجماع اور اختلاف کے امام تھے، تاریخ اور لوگوں کے ایام (جنگوں) کے علامہ، قراءات اور لغت وغیرہ کے ماہر تھے۔''

(سير اعلام النبلاء : ۲۷۱/۱٤)

لغت کے یہ ماہر امام اور مفسرِ قرآن لکھتے ہیں:

یعنی بالتّقلّب : التّحوّل والتّصرّف ، ویعنی بقوله : فی السّماء : نحو السّماء وقِبَلها ... ''تقلُّب سے مراد (چہرے کو) پھیرنا اور تبدیل کرنا ہے اور فرمانِ باری تعالیٰ **فِی السَّمَاءِ** سے مراد آسمان کی جہت اور طرف ہے۔'' (تفسیر طبری : ۱۷۲/۳)

علامہ زمخشری (م ۵۳۸ھ) لکھتے ہیں: **تقلّب وجهک : تردّد وجهک وتصرّف نظرک فی جهة السّماء ، وکان یتوقّع من ربّه أن یحوّله الی الکعبة ...**

'' **تقلّب وجهک** کا معنیٰ آپ کا اپنے چہرۂ مبارک اور اپنی نظرِ مبارک کو آسمان کی طرف پھیرنا ہے، آپ ﷺ اپنے رب تعالیٰ سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کا قبلہ کعبہ کی طرف پھیر دے گا۔''
(الکشاف : ۲۲۸/۱)

یہ علامہ زمخشری وہ ہیں، جن کے بارے میں ناقدِ رجال حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وکان رأسا فی البلاغة والعربیّة والمعانی والبیان ، وله نظم جیّد . ''آپ بلاغت ،عربیت، علم معانی و بیان میں ماہر تھے، آپ کے بڑے عمدہ اشعار بھی ہیں۔''

(سیر اعلام النبلاء للذهبی : ۱٥٤/۲۰)

علامہ بیضاوی لکھتے ہیں: **تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَاءِ : تردّد وجهک فی جهة السّماء تطلّعا للوحی ...** ''اس سے مراد آپ ﷺ کا وحی کے انتظار میں اپنے چہرے کو آسمان کی طرف بار بار پھیرنا ہے۔'' (تفسیر البیضاوی : ٤۲۰/۱)

اگر ہم اس آیت کی تفسیر میں تمام مفسرین کے اقوال پیش کرنا شروع کر دیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے، ہم صرف ان چند حوالہ جات پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

قارئین کرام! تابعین کرام اور مفسرینِ قرآن کیا لغتِ عرب سے ناواقف تھے؟ امام قتادہ جو کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک مفسر قرآن ہیں، وہ یہی ترجمہ کر رہے ہیں، امام ابنِ جریر رحمہ اللہ بقولِ حافظ ذہبی رحمہ اللہ عربی دان ہیں، وہ یہی معنیٰ کر رہے ہیں، علامہ زمخشری جو حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے ہاں لغتِ عرب کے ماہر، فصیح بلیغ اور بہترین عربی شاعر بھی ہیں، اس معنیٰ کو صحیح قرار دیتے ہیں، علامہ بیضاوی جو کہ عربی لغت و معانی کے امام سمجھے جاتے ہیں، یہ تفسیر کر رہے ہیں، نیز آج تک آنے والے

تمام مسلمان مفسرین اس معنیٰ کو صحیح قرار دیتے آئے ہیں، کسی نے اسے لغوی یا عقلی اعتبار سے غلط قرار نہیں دیا، کیا وہ سب جاہل تھے؟

اب آپ خود ہی اندازہ کرلیں کہ میرٹھی صاحب کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ ''منثور و منظوم کلامِ عرب سے تقلّب وجه کے اس معنیٰ کا سراغ نہیں لگ سکتا۔''

خود میرٹھی صاحب کا ''فرمان'' ہے کہ ''لغتِ عرب میں تقلّب الٹنے پلٹنے اور کروٹ بدلنے کے معنیٰ میں ہے۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ٤١/١)

پھر عربی لغت میں وَجْهٌ کا معنیٰ چہرہ ہوتا ہے، جس سے کسی منکرِ حدیث کو انکار نہیں۔

لیکن نہ جانے اس ''الٹنے پلٹنے'' کے ساتھ جب وَجْـهٌ (چہرے) کا لفظ حدیث میں آگیا تو اس کا معنیٰ ''چہرے کو الٹنا پلٹنا'' کیوں صحیح نہیں رہا؟

(٢) تمام سلف صالحین اور ساری امتِ مسلمہ کے متفقہ فہم قرآن کو غلط قرار دیتے ہوئے جو معنیٰ میرٹھی صاحب نے کیا ہے کہ یہ ''کنایہ ہے بے چینی اور قلق و اضطراب سے۔۔۔'' تو اس سے کسی کو کوئی بھی اختلاف نہیں، ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ قبلہ تبدیل ہونے کی خواہش میں اپنے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھا رہے تھے تو اس وقت آپ بے چین اور قلق و اضطراب میں ہی تھے۔

(٣) ہمارا منکرینِ حدیث سے سوال ہے کہ انہوں نے اپنے کیے گئے معنیٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کوئی منثور و منظوم کلام کیوں پیش نہیں کی؟ میرٹھی صاحب تو اللہ کی عدالت میں پہنچ چکے، اب ان کا کوئی فیض یافتہ ہی ان کی اس بات کا ثبوت قدیم عربوں کی منثور و منظوم کلام سے پیش کرے کہ وہ تقلّب وجه کے ''چہرے کو الٹنے پلٹنے'' والے معنیٰ کو غلط کہتے ہوں اور اسے صرف قلق و اضطراب سے کنایہ قرار دیتے ہوں!

(٤) میرٹھی صاحب کہتے ہیں کہ ''فی السّماء کا صحیح ترجمہ ہے آسمان میں، اس کا ترجمہ آسمان کی طرف کرنا قطعاً غلط ہے۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ٤١/١)

لیکن یقین جانیے کہ میرٹھی صاحب کی یہ بات ان کی اپنی جہالت اور قطعاً غلط ہے، کیونکہ لغتِ

عرب میں فِــیْ کو اِلٰــی کے معنیٰ میں استعمال کیا جانا معروف ہے، جیسا کہ عربی لغت کی مشہور ومعروف کتاب تاج العروس میں لکھا ہے کہ فِیْ کو الٰی کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(تاج العروس : ٢٦٤/٣٩)

عربی ادب ولغت کے امام اور ناقد، ابنِ قتیبہ دینوری (م۲۷۶ھ) یہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بعض حروف دوسرے حروف کے معانی میں استعمال ہوجاتے ہیں: **و(فی) مکان (الی)** ....

''اور فِیْ کو الٰی کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔'' (ادب الکاتب : ۳۹۹/۱)

ابنِ قتیبہ تمام امتِ مسلمہ کے ہاں مسلم لغوی اور ادیب تھے، ان کے بارے میں حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **النّحویّ اللّغویّ صاحب المصنّفات البدیعة المفیدة المحتویة علی علوم جمّة نافعة** ... ''آپ نحوی اور لغوی تھے، تمام مفید علوم کے بارے میں آپ کی مفید، بے مثال اور جامع تصنیفات موجود ہیں۔'' (البدایة والنهایه لابن کثیر : ٦٥/١١)

اسی طرح نحو اور لغت کی دوسری کتب مثلاً **أوضح المسالک ، شرح الرّضیّ علی الکافیه** اور **مغنی اللّبیب** وغیرہ میں یہ بات لکھی ہوئی ہے، لیکن کریں کیا کہ ہمیں ایسے منکرینِ حدیث سے پالا پڑا ہے، جو لغت وادبِ عربی سے یکسر جاہل ہیں۔ صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے سے پہلے منکرینِ حدیث کو کم از کم لغت اور دوسرے ضروری عربی فنون پر تو مہارت حاصل کرلینی چاہیے!

یہ حالت ہے میرٹھی صاحب کی جہالتِ مطلقہ کی اور وہ کیسے بے باکی سے سلف صالحین کے ترجے پر ''غلط سلط'' کا فتوی لگا رہے ہیں۔

⑥ جب یہ ثابت ہوگیا کہ فی ، الٰی کے معنیٰ میں مستعمل ہے تو میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض بالکل باطل ہوگیا کہ ''مترجمین نے فی السّماء کو تقلّب کے متعلق سمجھ لیا ہے، حالانکہ اس کا تعلق فعل نریٰ سے ہے۔'' کیونکہ اس صورت میں نریٰ سے اس کا تعلق بن ہی نہیں سکتا۔ اگر بنائیں تو معنیٰ یوں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ہم آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔'' جو کہ صریح طور پر غلط ہے۔

⑦ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا کے ترجمے پر تبصرہ اعتراض نمبر ⑦ کے تحت گزر چکا ہے۔اس کا مطالعہ کرنے سے ہر ذی شعور شخص میرٹھی صاحب کی صداقت و دیانت سے واقف ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ !

معلوم ہوا کہ آیتِ کریمہ کے صحیح ترجمے میں میرٹھی صاحب کی لگائی گئی تینوں ''فاش وصریح غلطیاں'' دراصل ان کی اپنی فاش وصریح غلطیاں ہیں اور ان کے لغتِ عرب کی ابجد سے بھی ناواقف ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ اسے ہی کہتے ہیں ''چور بھی کہے چور چور۔''

ع الزام ہم کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا۔

خیانتوں اور جہالتوں کا اتوار بازار

اعتراض نمبر ⑩ : صحیح بخاری میں موجود امام سفیان ثوری کی حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے میرٹھی صاحب لکھتے ہیں: ''ہم سے ابواسحاق سبیعی نے بیان کیا کہ میں نے براء بن عازب سے سنا کہ ہم (یعنی انصارِ مدینہ) نے نبی ﷺ کے ساتھ یعنی آپ کی موجودگی میں ۱۶ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی، پھر اللہ نے آپ کو اصل قبلہ کی طرف پھیر دیا، یعنی حتماً حکم دے دیا کہ کعبہ رخ ہو کر نماز پڑھی جائے۔سفیان ثوری رحمہ اللہ نے ابواسحاق سبیعی سے حدیثیں ان کے ہوش وحواس اور حفظ وضبط میں فتور آنے سے قبل سنی ہیں، لہٰذا یہ حدیث صحیح و قابل اعتماد ہے اور اس وہ فضولیات اور الٹی سیدھی غلط سلط باتیں نہیں ہیں، جو ابواسحاق کے ان تلامذہ کی روایات میں ہیں، جنہوں نے ابواسحاق سے یہ حدیث ان کے مخبوط الحواس ہونے کے زمانہ میں سنی تھیں اور سفیان ثوری کی اس روایت میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا یہ جو قول مذکور ہے کہ ہم نے نبی ﷺ کے ساتھ ۱۶ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود حضورِ اکرم ﷺ نے بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے مدینہ میں نماز پڑھی تھی، بلکہ یہ عمل مدینہ میں رہنے والے انصاری مسلمانوں کا تھا، بیعتِ عقبہ اولیٰ کے موقع پر اہل مدینہ میں سے جو سات حضرات مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، ان کی گذارش کے مطابق آپ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ معلّم و مبلغ

کی حیثیت سے بھیج دیا تھا، انہوں نے یثرب پہنچ کر بڑی تندہی و جاں فشانی کے ساتھ تبلیغِ حق فرمائی، ان کی اور نو مسلم انصار کی کوششیں بڑی مبارک و ثمر آور ہوئیں اور ایک سال کے اندر مدینہ کے ایک ایک گھر میں اسلام ایک محبوب و پسندیدہ دین کی حیثیت سے داخل ہو گیا، مدینہ کے ان مسلمان ہو جانے والے اشخاص کو حضرت مصعب نے نماز اور اس کے اوقات کی تعلیم دی تھی، لیکن وہ اس حکم سے واقف نہ تھے کہ نماز کعبہ رخ ہی پڑھنی چاہیے، ان حضرات نے اسلام اور یہود کے دین کو یکساں ہی خیال کیا تھا، کیونکہ یہود بھی بت پرستی نہ کرتے تھے اور ان میں سے جو لوگ نماز پڑھتے تھے، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھتے تھے، انصاری مسلمانوں نے بھی یہود کی دیکھا دیکھی بیت المقدس کو ہی قبلہ قرار دے لیا تھا۔'' (((صحیح بخاری کا مطالعہ)) : ۱/۴۳۔۴۴)

جواب: ① ہم گذشتہ قسطوں میں یہ بیان اتنی وضاحت و تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں کہ جس سے ہر ذی شعور شخص سمجھ سکتا ہے کہ امام سفیان ثوری کی طرح امام شعبہ اور امام اسرائیل بن یونس نے بھی امام ابو اسحاق السبیعی سے قبل الاختلاط روایات سنی ہیں، جو کہ بالاتفاق صحیح ہوتی ہیں اور اسرائیل بن یونس نے وہ الفاظ بیان کیے ہیں، جن کو میرٹھی صاحب ''فضولیات اور الٹی سیدھی غلط سلط باتیں'' قرار دے رہے ہیں، لہٰذا منکرینِ حدیث کو میرٹھی صاحب کی بات ماننے کی بجائے ان کی جہالت پر افسوس کرنا چاہیے!

② اس حدیث کے ترجمہ میں میرٹھی صاحب نے تحریفِ معنوی کا عالمی ریکارڈ توڑنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ **صلّینا مع النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم** ... کا ترجمہ یہ کرنا کہ ''ہم نے آپ کی موجودگی میں نمازیں پڑھیں۔۔۔'' اور پھر کہنا کہ ''اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود حضورِ اکرم ﷺ نے بھی بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے مدینہ میں نماز پڑھی تھی، بلکہ یہ عمل مدینہ میں رہنے والے انصاری مسلمانوں کا تھا۔''

اسی طرح غلط ہے جس طرح کوئی صحیح بخاری کی ہی حدیث (۱۰۸۱) **خرجنا مع النبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم من المدینۃ الی مکّۃ** ... (سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم

ﷺ کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف نکلے) اس کا یہ ترجمہ کرے کہ ''ہم نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں مدینہ سے مکہ کی طرف نکلے۔'' اور پھر وہ کہہ دے کہ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود حضورِ اکرم ﷺ بھی مدینہ کی طرف نکلے تھے، بلکہ یہ عمل مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں کا تھا۔''

نیز میرٹھی صاحب کے معتقدین سے ہمارا سوال ہے کہ کیا سیدنا براء بن عازب اور دوسرے تمام مدنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے خلاف نمازیں ادا کرتے رہے؟ أعاذنا الله من هذه الهفوات! کسی قرینے و دلیل کے بغیر میرٹھی صاحب کا یہ معنیٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے، جبکہ امتِ مسلمہ کا اجماع بھی اس کو باطل قرار دے رہا ہے؟

③ اس حدیث کے ترجمہ میں تحریفِ معنوی کا دوسرا شاہکار میرٹھی صاحب کا یہ ترجمہ ہے کہ ''پھر اللہ نے آپ کو اصل قبلہ، یعنی خانۂ کعبہ کی طرف پھیر دیا، یعنی حتماً حکم دے دیا کہ کعبہ رُخ ہو کر نماز پڑھی جائے۔'' (((صحيح بخاری کا مطالعہ)) : ۴۳/۱)

میرٹھی صاحب کے ہمنوا ہمیں بتائیں ثمّ صرّفه نحو القبلة ... کا اجماعِ امت کے خلاف ''حتماً حکم دے دیا'' والے ترجمہ کا سراغ عربی کی کس منثور و منظوم کلام یا لغت سے لگتا ہے؟

اس کا واضح اور صاف معنیٰ وہی ہے جو ساری امت چودہ سو سالوں سے کرتی چلی آ رہی ہے کہ:

''پھر آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے (بیت المقدس سے) خانۂ کعبہ کی طرف پھیر دیا (یعنی آپ کا قبلہ بدل دیا)۔''

اس کی سند پر چونکہ میرٹھی صاحب کوئی کلام نہیں کر پائے تھے، لہٰذا انہوں نے اس طرح کی جاہلانہ، فضول اور بے تکی واہیات کے ذریعہ جان بچانے کی کوشش کی ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث، جس پر میرٹھی صاحب کوئی اعتراض نہیں کر پائے ہیں، اس میں موجود الفاظ میرٹھی کمپنی کے منہ پر زوردار طمانچہ ہیں کہ:

انّ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم كان يصلّى نحو بيت المقدس ، فنزلت ..

''رسول اللہ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے، پھر یہ (تحویل قبلہ والی)

آیت نازل ہوگئی۔۔۔''(صحیح مسلم : ۵۲۷)

④ میرٹھی صاحب کے بقول رسول اللہ ﷺ کے مدینہ بھیجے ہوئے صحابی سیدنا مصعب بن عمیر اور دوسرے مدنی صحابہ اس حکم سے واقف نہ تھے کہ نماز کعبہ رخ ہی پڑھنی چاہیے، ان حضرات نے اسلام اور یہود کے دین کو یکساں ہی خیال کیا تھا، میرٹھی صاحب کی اس بات کو صحیح سمجھ لینا کتنی بڑی جسارت اور ڈھٹائی کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ والوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایسے صحابی کو بھیج دیا، جسے نماز کے قبلہ کا بھی علم نہیں تھا۔

نیز یہ کتنا احمقانہ کلمہ ہے کہ صحابہ کرام نے دینِ اسلام اور دینِ یہود کو یکساں خیال کرلیا تھا، کیا منکرینِ حدیث کے نزدیک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بلاسوچے سمجھے مسلمان ہو گئے تھے؟

پھر یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے کہ اسلام اور دینِ یہود ملتا جلتا تھا، اس کا اندازہ صحیح مسلم وغیرہ کی اس حدیث سے ہوسکتا ہے، سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودی اپنی بیویوں کو ایامِ ماہواری میں اپنے گھروں سے باہر نکال دیتے تھے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کو جائز نہیں سمجھتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمان جاری کیا کہ سوائے جماع کے ان کے ساتھ ہر طرح کا تعلق ان ایام میں روا ہے تو یہود نے کہا: **ما يريد هذا الرّجل أن يدع من أمرنا شيئا الّا خالفنا فيه ...** ''یہ شخص (نبی کریم ﷺ) تو صرف ہر معاملے میں ہماری مخالفت کرنا چاہتا ہے۔''(صحیح مسلم : ۳۰۲)

یہود تو پکار پکار کر یہ کہیں کہ رسولِ کریم ﷺ ہر معاملے میں ان کی مخالفت کرتے ہیں اور میرٹھی صاحب آپ ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں یہ حکم لگائیں کہ انہیں اسلام اور دینِ یہود یکساں لگتے تھے، اس لیے انہوں نے قبلہ ہی یہود کا اپنالیا تھا، یہ یاوہ گوئی اور بے وقوفی کی انتہا ہے!

اعتراض نمبر ⑪ : ''آپ نے اوائل ہجرت میں مقام قبا میں قیام کے زمانہ میں مسجد بنوائی تو وہ کعبہ رُخ ہی تھی، جیسے دنیا بھر کی تمام مسجدیں کعبہ رخ ہوتی ہیں۔ پھر آپ مدینہ تشریف لے گئے تو چند روز بعد آپ نے وہ مسجد بنوائی جسے مسجدِ نبوی کہا جاتا ہے، وہ بھی اول روز سے کعبہ رخ ہی رہی ہے۔۔۔اب ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس زمانہ میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے

ہوتے تو یہ دونوں مسجدیں بیت المقدس کے رخ پر تعمیر کی جاتیں، یعنی ان کی دیوار قبلہ سمتِ شمال ہوتی، پھر تحویل قبلہ کا حکم آجانے پر وہ منہدم کی جاتی اور سمتِ جنوب تعمیر کی جاتی اور ایسا ہوا ہوتا تو ضرور منقول ہوتا، کیونکہ مسجدِ نبوی کے تمام تعمیری تغیرات آغازِ بنا سے لے کر آج تک بطریقِ متواتر منقول ہوتے چلے آئے ہیں۔'' («صحیح بخاری کا مطالعہ» : ۱/۴۴۔۴۵)

جواب: ① منکرینِ حدیث اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے کہ مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی میں پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی جاتی تھی تو شمال والی دیوار کی طرف رخ کیا جاتا تھا اور پھر جب قبلہ خانۂ کعبہ کی طرف تبدیل ہو گیا تو جنوب والی دیوار کی طرف رخ کیا جانے لگا۔ ان مسجدوں میں کون سے محراب یا مینار بنائے گئے تھے کہ جس سے کوئی دیوارِ قبلہ متعین ہوتی اور پھر اسے تبدیل کرنا پڑتا؟

② پھر میرٹھی صاحب نے مسجدِ نبوی کے تمام تعمیری تغیرات کا بطریقِ متواتر منقول ہونا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر دیوارِ قبلہ منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کی گئی ہوتی تو یہ بات ضرور منقول ہوتی۔

ان کے معتقدین سے ہمارا سوال ہے کہ کیا تحویل قبلہ کے حق ہونے کے بارے میں امتِ مسلمہ کا چودہ سو سالہ تواتر ان کو نظر نہیں آیا جسے سب مفسرین و محدثین نقل کرتے آئے ہیں؟

یہ عجیب منطق ہے کہ جو چیز تواتر سے منقول ہے، اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور منہدم کر کے دیواریں دوبارہ بنانا، جس کا ہم نے دعوی ہی نہیں کیا، اس پر تواتر کی دلیل کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!

قارئین کرام ہی بتائیں کہ یہ کس عدالت کا انصاف ہے؟

الحمدللہ! ہم نے قرآن، حدیث، عربی لغت و ادب اور عقل و فہم ہر طرح سے نبی کریم ﷺ کا پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اور تحویل قبلہ کے بعد خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرنا ثابت کر دیا ہے۔ لغتِ عرب، حدیث، اصولِ حدیث اور تفسیر سے اتنی جہالت کے باوجود میرٹھی صاحب کی دعوت ہے کہ ''آیاتِ قبلہ کے صحیح تفسیر جاننے کے لیے ہر پڑھے لکھے شخص کو تفسیر مفتاح القرآن کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، اس میں تحویل قبلہ کے متعلق سیر حاصل کلام کیا گیا ہے۔'' («مطالعہ» : ۱/۴۶)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر گامزن فرما دے! آمین

اہل سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

امام محمد بن عبدالوہاب ؒ (۱۱۱۵-۱۲۰۶ھ) اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے اور اسی کو اپنا عقیدہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''میں اللہ کو، اپنے پاس موجود فرشتوں کو اور آپ کو گواہ بنا کر گواہی دیتا ہوں کہ میرا وہی عقیدہ ہے، جو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، موت کے بعد جی اٹھنے اور اچھی بری تقدیر پر ایمان کے بارے میں اہل سنت والجماعت عقیدہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان سے مراد اس کی ان تمام صفات پر بغیر تحریف وتعطیل ایمان لانا ہے، جو اس نے اپنے لیے اپنی کتاب میں اور اپنے نبی ﷺ کی زبان سے بیان کی ہیں، میں یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں، جیسا کہ اس نے فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾(الشوریٰ : ۱۱/۴۲)(اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سمیع وبصیر ہے)، میں اس کی بیان کردہ کسی صفت کا انکار نہیں کرتا، نہ میں اس کے کلمات کو (تاویل باطل کر کے) ان کی جگہ سے ہٹاتا ہوں، نہ اس کے اسماء وصفات میں الحاد سے کام لیتا ہوں، نہ میں صفاتِ الٰہی کی کوئی کیفیت بیان کرتا ہوں، نہ ان کو مخلوق کی صفات سے مشابہت دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم نام نہیں، نہ ہی کوئی اس کا شریک ہے، نہ ہی اس کو اس کی مخلوق پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اور دوسروں کے بارے میں خوب جاننے والا ہے، وہ قول میں سب سے سچا اور بات میں سب سے اچھا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے مخالفین، یعنی اہل تکییف واہل تمثیل نے اس کے جو اوصاف بیان کیے ہیں، وہ ان سے منزہ ہے اور اہل تحریف وتعطیل نے اس کی صفات کا جو انکار کیا ہے، وہ اس سے بھی مبرا ہے، فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ☆ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ☆ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾

(الصافات : ۱۸۰/۳۷-۱۸۲) (تیرا عزت والا رب ان باتوں سے منزہ ہے، جو وہ بیان کرتے ہیں، رسولوں پر سلام ہو اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جو سب جہانوں کا رب ہے) چنانچہ فرقۂ ناجیہ افعالِ باری تعالیٰ کے بارے میں قدریہ وجبریہ کے مذہب درمیان اعتدال پر ہیں، وعیدِ الٰہی کے بارے میں وہ وعیدیہ اور مرجیہ کے مذہب کے درمیان اعتدال پر ہیں، ایمان ودین کے بارے میں وہ حروریہ ومعتزلہ اور مرجیہ وجہمیہ کے مذہب کے درمیان اعتدال پر ہیں اور اصحابِ رسول ﷺ کے بارے میں وہ رافضیوں اور خارجیوں کے مذہب کے درمیان نقطۂ اعتدال پر ہیں۔ میں یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ قرآنِ کریم کلامِ الٰہی ہے، اس کے طرف سے نازل شدہ ہے، مخلوق نہیں، یہ کلام اسی سے شروع ہوئی ہے اور اسی طرف لوٹ جائے گی، اللہ تعالیٰ نے حقیقتاً اس کی کلام کی ہے اور اسے اپنے بندے، رسولِ امین اور ہمارے پیارے نبی محمد ﷺ پر اپنے فرشتے کے ذریعے وحی کیا۔ میں یہ بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، ہر چیز اس کے ارادے کے ساتھ ہی ہوتی ہے، اس کی مشیئت سے کوئی چیز خارج نہیں، نہ ہی کائنات کی کوئی چیز اس کے تقدیر سے باہر ہے، ہر کام اس کی تدبیر سے ہی صادر ہوتا ہے۔ کسی کے لیے مقررہ تقدیر سے فرار ممکن نہیں ہے اور جو کچھ لوحِ محفوظ میں لکھا گیا ہے، اس سے کوئی چیز تجاوز نہیں کر سکتی۔''

(مولفات الشیخ الامام محمد بن عبد الوهاب : ص ۸-۹)　　جاری ہے۔۔۔

حائضہ کو دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے!

غلام مصطفٰے ظہیر امن پوری

حائضہ کو دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے، جیسا کہ نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مره ، فليراجعها ، ثمّ ليطلّقها طاهرا أو حاملا . ''انہیں حکم دیں کہ وہ رجوع کرلیں، پھر طہر یا حمل کی حالت میں طلاق دیں۔''(صحيح بخاری : ٥٢٥١، صحيح مسلم : ١٤٧١، واللفظ له)

فليراجعها کے الفاظ واضح طور پر وقوعِ طلاق کا پتا دے رہے ہیں، اگر طلاق واقع نہیں ہوئی تھی تو رجوع کیسا؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان الفاظ پر یوں تبویب فرمائی ہے: ''اس بات کا بیان کہ جب حائضہ کو طلاق دی جائے تو وہ شمار ہوگی۔''

ہمارے موقف کی مزید تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا اس طلاق کو شمار کیا جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں! (سنن الدارقطنی : ٥/٤، السنن الكبرٰى للبيهقي : ٣٢٦/٧، وسندهٗ حسنٌ) نیز سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ بیان کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک طلاق شمار کیا۔ (مسند الطيالسی : ٦٨، مسند عمر بن خطاب لابن النجاد : ١، وسندهٗ صحيحٌ) صاحبِ واقعہ سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما خود فرماتے ہیں: ''یہ میری ایک طلاق شمار کی گئی۔'' (صحيح بخاری : ٥٢٥٣) راویٔ حدیث عبیداللہ بن عمر العمری کہتے ہیں: ''سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی اپنی بیوی کو حیض میں دی گئی طلاق ایک شمار ہوگئی تھی، اگرچہ ان کی یہ طلاق سنی نہ تھی۔'' (سنن الدارقطنی : ٦/٤، مسند عمر بن الخطاب ، تحت حديث : ٣، وسندهٗ حسنٌ)

امام عطاء بن ابی رباح (مصنف ابن ابی شيبة : ٥/٥، وسندهٗ صحيحٌ)، امام زہری (ايضا ، وسندهٗ صحيحٌ)، امام ابنِ سیرین (ايضا ، وسندهٗ صحيحٌ)، امام جابر بن زید (ايضا ، وسندهٗ صحيحٌ) اور تمام محدثین وائمہ دین رحمہم اللہ حیض میں طلاق کو مؤثر سمجھتے تھے۔ اگرچہ حالتِ حیض میں طلاق سنی نہیں ہے، لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نافذ بھی کیا ہے، لہٰذا اس کے وقوع میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ سنن ابی داؤد (٢١٨٥) میں یہ الفاظ ہیں کہ: **فردّها رسول الله صلّى الله عليه وسلّم ، ولم يرها شيئا ...** ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوٹا دیا اور آپ نے اسے (طلاقِ سنی) نہیں سمجھا۔''
اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ حیض میں طلاق کو شمار تو کیا ہے، لیکن مستحسن خیال نہیں کیا۔

سنن النسائی (٣٤٢٧، وسندہٗ صحیح) کے الفاظ ہیں: ''سیدنا ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دی تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس (بیوی) کو واپس کر دیا (رجوع کا حکم دیا) حتی کہ انہوں نے اسے حالتِ طہر میں طلاق دی۔''
مطلب یہ ہے کہ پہلی طلاق کے واقع ہو جانے کے بعد رجوع کیا، اس کے بعد حالتِ طہر میں دوسری طلاق دی، اس طرح تمام روایات میں تطبیق ہو جائے گی، کیونکہ صحیح حدیث اور سیدنا ابنِ عمر W کے اپنے بیان سے ثابت ہے کہ حالتِ حیض والی طلاق موثر ہوتی ہے۔